یعنی

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا سفرنامہ جس میں مولانا نے ٹرکی، شام اور مصر کے

مسلمانوں کے علمی، تعلیمی، اخلاقی اور تمدنی حالات اور دیگر وقائعِ

سفر، اور حوادثِ سیاحت بہ تفصیل بیان کئے ہیں

باھتمام

مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپا

سنہ ۱۳۵۹ھ
۱۹۴۰ء
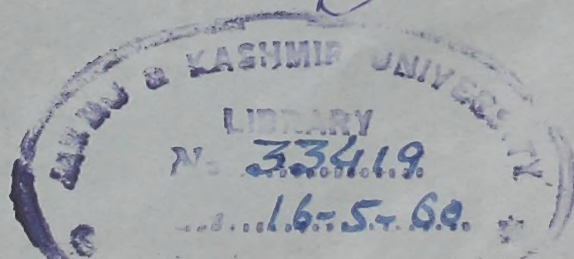
فہرست مضامین

سفرنامۂ روم ومصر وشام

سفرنامۂ روم
و
مصر و شام

جس میں علاوہ اُن جزئی دلچسپ واقعات کے جو سلسلۂ بیان میں آگئے ہیں قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس، قاہرہ وغیرہ کے متعلق واقعاتِ ذیل یعنی شہر کی عام اجمالی حالت، قابل دید مقامات، سررشتۂ تعلیم، دار العلوم اور مدارس، بورڈنگ اور طلبہ کی تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین اور تصنیفات، کتبخانے، اخبارات اور رسالے، مشہور پاشاؤں اور اربابِ کمال کی ملاقات، ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، آخر میں اُن الفاظ مولدہ کی مختصر سی فرہنگ ہے، جو آج کل مصر و شام میں مستعمل ہو گئے ہیں اور جن کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگ عربی اخبارات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے،

مرتبہ

شبلی نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

در موسم گل گر بہ گلستاں نرسیدیم   از دست ندادیم تماشاے خزاں را

رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ ۱۸۹۲ء میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا، وہ محض ایک طالب العلمانہ سفر تھا، اور چونکہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا، نہ واقعاتِ سفر میں چنداں ندرت تھی، سفرنامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، سب سفرنامہ کے متقاضی تھے، میں نے خیال کیا کہ چونکہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع نہیں حاصل ہوتی، لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بیجا نہیں مجھکو خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا،

یہ اسباب تھے جنھوں نے مجھ کو ان اوراق پریشان کی ترتیب پر آمادہ کیا، ورنہ ایسے عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلمبند کرنے اور ان کو سفرنامہ یا کتاب الرحلۃ کا لقب دینا تنگ ظرفی سے خالی نہ تھا، سفرنامہ میں جس قسم کی اطلاعیں لازمی اور ضروری ہیں یعنی ملک کی اجمالی حالت، انتظام کا طریقہ، عدالت کے اصول، تجارت کی کیفیت، عمارتوں کے نقشے، ان میں سے ایک چیز بھی اس سفرنامہ میں نہیں، البتہ معاشرت اور علمی حالت کے متعلق معتدبہ واقعات ہیں اگرچہ وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہیں جس قدر ہونے چاہئیں

غرض جو شخص سفرنامہ کو سفرنامہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا، البتہ جن لوگوں کو اسلامی ممالک کے معمولی واقعات میں بھی مزہ آتا ہو انکی دعوت میں یہ ماحضر پیش کیا جا سکتا ہو کہ ما لایدرک کلہ لا یترک کلہ،

میں نے اگرچہ اس کتاب میں ترکوں کی تمدنی یا ملکی حالت سے کچھ بحث نہیں کی ہے اور نہ اس قسم کی بحث میرے منصب و حالت کے لحاظ سے مناسب تھی، تاہم اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قائم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے،

یورپ نے کسی زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لئے تھے، ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقہ سے ظاہر کئے جاتے تھے، کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا، اور اس وقت قبول عام کا یہی بڑا عمدہ ذریعہ تھا، لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے تو اس پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا، اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصبانہ الفاظ لکھے جائیں بلکہ بجائے اس کے یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہو کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں، اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرایہ میں ظاہر کئے جاتے ہیں، اور عام تصنیفات قصوں، ناولوں ضرب المثلوں کے ذریعہ سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جدا نہیں ہو سکتے اگرچہ یہ طریقہ کل اسلامی قوموں سے برتا جاتا ہے، لیکن اس وقت ہم کو خاص ترکوں سے بحث ہے، یورپین لٹریچر پڑھ کر ترکوں کی نسبت تحقیر کے خیالات نہ پیدا ہونے بعینہ ایسا ہے جیسا خواب آور دوا کھا کر نیند کا نہ آنا،

یورپ میں مصنفین کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس وجہ سے ان میں متعصب

نیک دل، ظاہر بیں، دقیق النظر، ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ ہیں، لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلافِ مدارج بالکل زائل ہو جاتا ہے، اور ہر ساز سے وہی ایک صدا نکلتی ہی،

مثلاً آج کل کے سچے سے سچے یورپین مصنف کی راست بیانی یہ ہے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں، قرضہ کی گرانباری صنائع و فنون کا بقدر کافی موجود نہ ہونا، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت، آلات و اسلحہ میں یورپ کی احتیاج، ان تمام امور کو بالکل راست راست لکھتا ہے، لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ہیں انکے ذکر سے اس طرح دامن بچا جاتا ہے کہ گویا اصلاح کا سرے سے وجود ہی نہیں، خزانہ کا انتظام، تمام اضلاع میں زراعتی بنکوں کا قائم ہونا، اور مدارس رشدیہ کی تعداد کا ۲۷۶ سے ۴۵۰ تک ترقی کر جانا، بڑے بڑے کالجوں کا جاری ہونا، ریلوے کی وسعت، ادائے قرضہ کے انتظامات، فوجی قوت کی ترقی، ان واقعات کو بھول کر نہیں لکھتا[1]،

کسی قوم یا کسی شخص کے قابلِ مدح یا ذم ثابت کرنے کا یہ نہایت آسان طریقہ ہے کہ اس کے حالات اور واقعات کی یک رخی تصویر کھینچی جائے، اور انصاف یہ ہی کہ یورپ نے اس فریب آمیز طریقہ کو دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ برتا ہے،

بے شبہہ یورپ میں ایسے فیاض دل بھی ہیں جنکو تعصب سے کچھ واسطہ نہیں لیکن بچپن سے جس قسم کے خیالات میں اُنھوں نے پرورش پائی ہے، ان کے گرد و پیش معلومات کا جو سرمایہ ہے، جو آوازیں ہر طرف سے ان کے کانوں میں آتی ہیں، ان چیزوں کے مقابلہ

---

[1] سلطان حال کے عہد میں جو علمی اور عملی ترقیاں ہوئی ہیں، اسکی تفصیل میں ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہی جو قسطنطنیہ میں شائع ہوئی ہی، اور خاص بحری ترقیوں کے ذکر میں راسم بک آفندی کا رسالہ حال میں شائع ہوا ہے، جس کا نام "دور ترقی" ہی،

ہیں ان کی بے تعصبی بھی کچھ کام نہیں دیتی، ایک صاحب جو نہایت بے تعصب اور عالم شخص
ہیں، اور مجھ کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے قسطنطنیہ و مصر وغیرہ کا سفر کر کے واپس
آئے تو میں نے اُن سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ آپ نے قاہرہ میں جامع ازہر کی سیر بھی کی؟
بولے "مجھ کو اس کی سیر کا بہت شوق تھا، لیکن میرے رہنما نے کہا کہ عیسائیوں کو وہاں جانے
کی اجازت نہیں ہے"۔ اگرچہ واقعہ محض غلط ہے میں خود جامع ازہر میں ایک مہینہ سے زیادہ
مقیم رہا اور میرے عیسائی احباب بے تکلف مسجد ہی میں مجھ سے ملنے آتے تھے، لیکن
چونکہ یورپ میں مسلمانوں کا تعصب اور تنگ خیالی علوم متعارفہ کے قریب ہے، ان صاحب
کو اپنے رہنما کی بات کے یقین کرنے میں کیونکر تامل ہو سکتا تھا؟

طرہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے عام شاہراہ سے الگ ہو کر کچھ کہا یا لکھا تو یورپ
کے نقار خانہ میں اُس کی آواز طوطی کی آواز سمجھی جاتی ہے، ایک انگلش شہزادی نے
پندرہ سولہ برس قسطنطنیہ میں رہ کر "دوازدہ سالہ حکومت عبد الحمید ثانی" کے نام سے جو
کتاب لکھی ہے اگرچہ اس کے اعتبار کے لئے مصنفہ کی علمی قابلیت، پندرہ سولہ برس کا
تجربہ، دریافتِ حالات کے صحیح وسائل، یہ تمام قرائن موجود تھے، لیکن چونکہ وہ ترکوں
کی عیب گوئی میں یورپ کی ہمزبان نہ تھی، اس کو استناد اور اعتماد کا درجہ نہ حاصل ہو سکا
ہم نے تعلیمیافتہ اشخاص کو اس کی نسبت یہ کہتے سنا ہے کہ "عجب نہیں یہ کتاب فرضی مصنف
کے نام سے خود ترکوں نے لکھی ہو یا اُس انگلش شہزادی کو سلطانی انعامات نے ایسی کتاب
لکھنے پر مجبور کیا ہو"، لیکن یہی کتاب اگر ترکوں کے معائب میں ہوتی تو ان اشخاص کے نزدیک
اس کا ہر حرف قطعی و یقینی ہوتا، پروفیسر ویمبری نے اپنے محققانہ تجربہ سے ترکوں کی تہذیب
و شائستگی پر جو مضامین لکھے وہ بھی اسی وجہ سے بے اثر رہے کہ پروفیسر مذکور نے ترکوں

کی موجودہ علمی ترقی کا اعتراف کیا تھا،

ترکوں کی نسبت اگرچہ یورپ کے عام لٹریچر کی یہ حالت ہی لیکن ہکو موقع کے لحاظ سے ترکی کے سفرناموں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہئے، کیونکہ یورپ کی تاریخی تصنیفات کا سرمایہ بھی بہت کچھ انہی سفرناموں سے لیا گیا ہے، سفرنامہ اگرچہ تاریخی سلسلہ کا ایک دلچسپ حصہ ہے، لیکن جس قدر دلچسپ ہی اسی قدر غلطیوں کے احتمالات سے مملو ہی،

ایک بڑی غلطی جو عموماً سفرنامہ لکھنے والوں کو واقع ہوتی ہے، جزئیات سے کلیات کا قائم کرنا ہے، سفر میں انسان کو جن اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے، وہ اُن کے اخلاق، عادات، خیالات سے تمام قوم کی نسبت عام رائے قائم کرلیتا ہے، حالانکہ ممکن ہی کہ وہ امور انہی چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں، اسی طرح ہر واقعہ سے وہ ایک عام نتیجہ نکالنا چاہتا ہی، اور واقعہ کے خاص اسباب کی جستجو میں نہ وہ اپنا وقت صرف کرنا چاہتا ہی نہ اس کو اس قدر فرصت مل سکتی ہے،

غلطی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو شخص کسی ملک کا سفر کرتا ہے، اسکی نسبت پہلے سے اس کے خیالات دوستانہ یا مخالفانہ ہوتے ہیں، وہاں پہنچکر اول اول جو کچھ وہ دیکھتا اور سنتا ہے وہ محض سرسری ہوتا ہے، اور چونکہ ایسی اجمالی واقفیت، استنباطِ نتائج کے لئے کافی نہیں ہوتی اور وہ نتیجہ قائم کرنے میں دیر تک انتظار نہیں کر سکتا، اس لئے وہ ہر واقعہ کے ساتھ قیاسات کو دخل دیتا جاتا ہے، ان قیاسات کے وقت وہ حسن ظن یا سوء ظن جو پہلے سے اسکے دل میں موجود تھا، چپکے چپکے اپنا کام کرتا ہے اور اسکو خبر تک نہیں ہوتی، اس قسم کی غلطی کا احتمال اگرچہ دنیا کی تمام قوموں سے متعلق ہی، لیکن یورپ والوں کو اس میں ایک خاص ترجیح حاصل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ استنباطِ نتائج میں یورپ والوں کو

جو بے صبری ہے اور کسی قوم کو نہیں ہے، اسی کا اثر ہے کہ یورپ کا ایک عام سیاح یا پالٹشین اتفاق سے ہندوستان میں آنکلتا ہے تو صرف ہفتہ دو ہفتہ کے تجربہ کی بنا پر یورپ کے اخباروں اور میگزینوں میں اس دعوئی کے ساتھ بڑے بڑے آرٹکل شائع کرتا ہے کہ گویا ہندوستان کی معاشرت و تمدن کے تمام راز اس پر کھل گئے ہیں،

ایک اور بڑا سبب یہ ہے کہ سیاح کو چونکہ حالات کے دریافت کا نہایت شوق ہوتا ہے، اسلیئے وہ ہر شخص سے جو اس کو مل جاتا ہے کچھ نہ کچھ معلومات کا سرمایہ حاصل کرنا چاہتا ہے؛ اس تعمیم میں وہ ان تحقیقات کی کہ وہ شخص ثقہ ہے یا غیر ثقہ، روشن ضمیر ہے یا متعصب، دقیق النظر ہے یا ظاہر بین کچھ پرواہ نہیں کرتا اور کرنا بھی چاہے تو کامیابی نہیں ہو سکتی، یورپ والے اس باب میں اور بھی بے احتیاط ہیں، اکثر یورپین سیاح جو قسطنطنیہ کا سفر کرتے ہیں معمولاً بیوغلی اور غلطہ کے ہوٹلوں میں ان کو ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا ہے، وہ جہاں کہیں جانا چاہتے ہیں ایک گائڈ (رہنما) اُن کے ساتھ ہوتا ہے جو نہ صرف ان کو عمارات اور مقامات کی سیر کراتا ہے، بلکہ اُن کے تمام سوالات کا جو موقع بموقع وہ پوچھتے جاتے ہیں جواب دیتا جاتا ہے، یہ گائڈ عموماً عیسائی ہوتے ہیں، اور روپیہ دو روپیہ روزانہ اُن کی اجرت ہوتی ہے ان گائڈوں کی معلومات جس قسم کی ہو سکتی ہیں ہر شخص خود اس کا اندازہ کر سکتا ہے،

فاطمہ[1] خانم نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یورپ کی معزز خاتونیں جن سے

---

[1] یہ ایک نہایت معزز اور تعلیم یافتہ خاتون ہے، عربی و فارسی و ترکی کے علاوہ (جو اس کی مادری زبان ہے) فرنچ زبان نہایت عمدہ جانتی ہے، یورپ کو ترکی خاتونوں کی نسبت جس قسم کی غلط معلومات حاصل ہیں انکی اصلاح کیلئے اس نے ناول کے طور پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام نساء المسلمین ہے، یہ کتاب عربی میں ترجمہ ہو گئی ہے اور امریکہ کی نمائش میں پیش ہو کر وہاں کے اہتمام سے انگریزی میں بھی اسکا ترجمہ ہو گیا ہے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا ہے، انجمن پریس علی گڈھ میں چھپا ہے۔"

مجھ کو ملنے کا اتفاق ہوا، جب ترکی خاتونوں کے متعلق واقعات کے طور پر کچھ بیان کرتی تھیں، تو مجھ کو گمان ہوتا تھا کہ یہ کسی اور قوم کا تذکرہ ہے، یا ناول کے طور کے قصے ہیں،" فاطمہ خانم نے اس پر راے دی ہے کہ "ان بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، گائڈ جو کچھ سیاحوں سے کہدیتے ہیں انکو یقین کرنا پڑتا ہے" ہمارے دوست جو جامع ازہر کی سیر سے محروم رہ گئے تھے ان کو بھی گائڈ ہی نے دھوکا دیا تھا،

غرض یورپ کی تحریروں اور سفرناموں سے میرے سفرنامہ کا مختلف ہونا لازمی بات تھی، اگرچہ اس اختلاف کے اسباب کے بیان کرنے میں اس قدر اطناب کہ بجاے خود ایک مستقل مضمون بنجائے موزوں نہ تھا،

ٹرکی کے سفر سے جو اثر میرے دل پر ہوا اس کا یہاں ظاہر کرنا چنداں ضرور نہیں، اس سفرنامہ کے پڑھنے سے خود اس کا پتہ لگ سکتا ہے، البتہ اس قدر کہنا ضرور ہے کہ سلطنت کی حیثیت سے اگر قطع نظر کیجائے تو مسلمانوں کی حالت وہاں بھی کچھ زیادہ مسرت اور اطمینان کے قابل نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بہت سی باتوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے قریب قریب ہے، صنعت سے ان کو کچھ واسطہ نہیں، تجارت میں ان کا بہت کم حصہ ہے معمولی دکاندار تک یہودی یا عیسائی ہیں، پُرانی تعلیم نہایت ابتر ہے، اور رہوتی جاتی ہے نئی تعلیم کے متعلق جو شکایت یہاں ہے وہاں بھی ہے، پُرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے، اور دونوں سے ملکر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے، پُرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں، نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہمت، غیرت، جوش، عزم، استقلال کے بجاے کل قوم پر (من حیث الاغلب) افسردگی سی چھائی ہوئی ہے، جو شخص جس حال میں ہے اُسی پر قانع ہے، موجودہ حالت تو یہ ہے، ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا،

سفر کا ارادہ اور آغاز

سفر کے ارادہ کا سبب

جس زمانہ میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا، اُسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہوسکتا، یہی خیال تھا جس نے اوّل اوّل اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی کیونکہ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے، ان سے ایک ایسا سلسلۂ تالیف ضرور تیار ہوسکتا ہے،

اگرچہ یہ عزم مستقل ہو چکا تھا لیکن چند در چند اسباب سے دیر ہوتی گئی، یہاں تک کہ بظاہر اسباب ناامیدی سی پیدا ہوگئی، اور وہ عزم ایک ضعیف سا خیال رہ گیا، گذشتہ سال عجیب اتفاقی طور پر اس ارادہ کو تحریک اور تحریک کے ساتھ تکمیل ہوئی، پچھلے سال میں اکثر بیمار رہا، یہاں تک کہ علاج سے تنگ آکر تبدیل آب و ہوا کا ارادہ کیا، چنانچہ مکان وغیرہ کے بندوبست کے لئے الموڑہ اور کشمیر میں دوستوں کو متعدد خط لکھے، اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ جو مدرسۃ العلوم کے پروفیسر فلاسفی اور میرے استاد ہیں (میں نے اُن سے فرنچ زبان سیکھی ہی) آج ہی کل ولایت جانے والے ہیں، دفعۃً خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کا ساتھ، اتفاق سے یہ سامان جمع ہوگئے اس موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے، چنانچہ اسی وقت صاحب موصوف کے پاس گیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں، اُنھوں نے نہایت خوشی ظاہر کی، اور فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہے، سفر کے ضروری کاموں میں مدد دونگا،

اسوقت جہاز کی روانگی میں صرف تین چار روز باقی تھے، احباب اور اعزہ نے سنا تو سخت متعجب ہوئے اور اکثروں نے سمجھایا کہ اس جلدی اور بے سروسامانی کے ساتھ اتنا بڑا لمبا سفر کون سی دانش مندی کی بات ہے، میں نے کہا، ع

ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

کالج میں گرمیوں کی تعطیل معمولاً تین مہینے کی ہوا کرتی ہے، مدت ملازمت کے لحاظ سے مجھ کو تین مہینے کی پریولج رخصت کا حق حاصل تھا، اس طرح دونوں کو ملا کر چھ مہینے کی رخصت مل گئی اور ۲۶ اپریل ۱۸۹۲ء کو میں علی گڈھ سے چل کھڑا ہوا، مسٹر آرنلڈ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے ایک دو دن پہلے جھانسی روانہ ہو گئے تھے، جھانسی کے اسٹیشن سے ان کا ساتھ ہوا، اور تمام راہ بڑے لطف و مسرت سے کٹی، مسٹر آرنلڈ نے حاجی رحمت اللہ بن داؤد کو جو بمبئی کے ایک معزز اور روشن ضمیر تاجر ہیں، خط کے ذریعہ سے اپنے آنے کی اطلاع دیدی تھی جس میں میری معیت کا بھی ذکر تھا، چونکہ اتفاقاً ہمارے پہلے انتظام میں کسی قدر تبدیلی ہو گئی، ہم لوگ تاریخ معینہ کے دو دن بعد بمبئی پہونچے، مسٹر آرنلڈ میرا اور اپنا اسباب لے کر واٹسن ہوٹل کو گئے، میں بازار میں پھر رہا تھا کہ ایک لڑکے سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے پوچھا کہ تم حاجی رحمت اللہ کو جانتے ہو بولا کہ آپ مولوی شبلی تو نہیں ہیں، میں اس کے اس تفرس پر جو کشف سے کم نہ تھا حیرت زدہ ہو گیا، اس نے کہا کہ ہم دو دن سے آپ کے لئے حیران ہوتے ہیں، چلئے! حاجی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں، حاجی صاحب نے مسٹر آرنلڈ کو بھی ہوٹل سے بلا لیا، اور ہم دونوں اُن کے باغ میں ٹھہرے،

جس روز ہم بمبئی پہنچے اُس کے دوسرے دن ہمارا جہاز روانہ ہونے کو تھا اس لئے

ہم نے اپنا تمام وقت سفر کے ضروری کاموں میں صرف کیا اور بمبئی میں جو اسلامی مدرسے اور انجمنیں ہیں، ان کی سیر نہ کر سکے، گِک کمپنی کی معرفت جہاز کا ٹکٹ لیا جس جہاز پر ہم جانے والے تھے اسکا کرایہ بمبئی سے پورٹ سعید تک سکنڈ کلاس کا ۱۱ غ ۱۰ تھا، میں نے یہ سخت غلطی کی کہ ریٹرن ٹکٹ نہیں لیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ واپسی کے وقت پورٹ سعید سے بمبئی تک کے لہ ۲۱ پونڈ یعنی ساڑھے ۳۳۵ روپے دینے پڑے پہلی مئی کی صبح کو نو بجے ہم جہاز پر سوار ہوئے قریباً بارہ بجے جہاز نے لنگر اُٹھایا، اور ہم نے بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا پڑھ کر ہندوستان کو خدا حافظ کہا، سکنڈ کلاس میں صرف پانچ مسافر تھے اور یہ عجیب اتفاق کہ سب کے سب مختلف قوم اور مختلف نسل سے تھے یعنی ایک مسلمان، ایک انگریز، ایک پارسی، ایک اسپینیز، ایک سیامی،

جہاز کی حرکت اوّل اوّل تو چنداں ناگوار نہیں معلوم ہوئی، لیکن شام کے قریب طبیعت متغیر ہونی شروع ہوئی، رات کا کھانا کھا کر سو رہے، صبح کو آنکھ کھلی تو عجیب کیفیت تھی، دوران سر اور متلی کی ایسی سخت تکلیف تھی جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی، دو دن غشی کی سی حالت رہی، جہاز کا ملازم کبھی کبھی چائے، بسکٹ، نارنگیاں لاتا تھا، کہ کچھ کھالو لیکن ان چیزوں کے دیکھنے سے اُبکائی آتی تھی، مسٹر آرنلڈ چائے پی لیا کرتے تھے، اگرچہ ہضم نہیں ہوتی تھی لیکن قے کرنے سے طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی، ان کے اصرار سے میں نے بھی دو ایک بار چائے پی کر قے کی اور فائدہ محسوس ہوا، تیسرے دن ہم سب اُٹھ بیٹھے،

سمندر کی ہوا،

ہم سنا کرتے تھے کہ سمندر کی ہوا تندرستی کے لئے نہایت مفید ہے، درحقیقت جہاز کا سفر بہتوں علاجوں کا ایک علاج ہے، میں جہاز پر سوار ہونے کے وقت تک ضعیف اور مضمحل تھا لیکن روز بروز چاق چست ہوتا گیا، طبیعت کو ہر وقت نشاط رہتا تھا، اور بھوک خوب لگتی تھی ہملوگوں

کو پانچ وقت کھانا ملتا تھا، یعنی صبح کو آٹھ بجے چائے' دودھ، بسکٹ، گیارہ بجے معمولی کھانا' جس مین متعدد قسم کے سالن ہوتے تھے، ایک بجے ٹفن، پانچ بجے ڈنر جسمین معمولی گوشت کے علاوہ، مرغ، بط، کبوتر، ہر قسم کی پڈنگ تر اور خشک میوے ہوتے تھے، کبھی کبھی برف کی قفلیاں بھی ہوتی تھیں، رات کو نو بجے چائے اور مکھن، ہر وقت کا کھانا پیٹ بھر کر کھاتے تھے اور سب ہضم ہو جاتا تھا،

مین تمام دن دریا کے سیر و تماشے مین مشغول رہتا تھا، مسٹر آرنلڈ نے عربی پڑھنی شروع کر دی تھی، ہمارے ساتھ جو اسپین کا عیسائی تھا، مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے سے بہت جلتا تھا' اکثر اُن کے پاس آتا اور تحقیر کے ساتھ عربی حرفوں کو نہایت بُرے لہجہ سے ادا کرتا اور کہتا کہ یہ زبان اونٹوں کی زبان ہے، اگرچہ مجھ کو اس کی ان حرکتوں سے رنج ہوتا تھا، لیکن جو قوم ایک مدت تک ذلت کے ساتھ عرب کے زیر دست رہ چکی تھی' عرب اور عربی زبان کے ساتھ اُس کا یہ سلوک بیجا نہ تھا،

چونکہ عام طور پر یہ مشہور رہے کہ جہاز پر پرند ذبح نہیں کئے جاتے اور مولوی سمیع اللہ خانصاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربہ سے اس کی تصدیق بھی کی ہے، مین نے دو' تین روز تک پرند کے گوشت کھانے سے پرہیز کیا، مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اسکا سبب دریافت کیا، مین نے کہا کہ ہمارے مذہب مین منخنقہ حرام ہے، بولے کہ اس جہاز پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں، گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے، چونکہ شرعًا اُن کی تنہا شہادت کافی نہ تھی، مین خود گیا اور اس کی تصدیق کی، ذبح کرنے والا عیسائی تھا، وہ ذبح کرنے کے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا' صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا، اگرچہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں، لیکن اس مسئلہ مین چند دنوں کے لئے مین شافعی بن گیا تھا، جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے'

جہاز پر مسٹر آرنلڈ وہ آرنلڈ نہیں رہے تھے جو علی گڈھ میں تھے، نہ وہ متانت تھی نہ وہ
کم آمیزی، اکثر ہنسی مذاق کیا کرتے، بچوں سے کھیلتے اور جہاز کی چھت پر اُچھلتے کودتے
چلتے، میں نے حالات سفر کے متعلق ایک قصیدہ لکھنا شروع کر دیا تھا، اور درحقیقت
سمندر کی فضا کچھ ایسی دلچسپ اور نشاط انگیز ہے کہ موزوں طبع آدمی جہاز کے سفر میں
خواہ مخواہ گنگنا اُٹھتا ہے،

سمالی قوم کے مبتذل حرکات

۲ مئی ۱۸۹۲ء کو جہاز عدن پہنچا اور کنارے سے کسی قدر فاصلہ پر لنگر انداز ہوا،
عدن میں بڑی دلچسپی یہ ہے کہ سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں پر سوار جہاز
کے قریب آتے ہیں اور جہاز والوں سے انعام لینے کے لئے عجیب عجیب مبتذل حرکتیں
کرتے ہیں، کچھ ناچتے گاتے ہیں، کچھ آپس میں مل کر بے معنی الفاظ کہتے ہیں، اور بغلیں
بجاتے جاتے ہیں، بڑا کمال یہ ہے کہ لوگ دوّنی، چوّنی، پیسے جو کچھ انعام دینا چاہتے
ہیں سمندر میں پھینک دیتے ہیں، اور وہ غوطے مار کر نکال لاتے ہیں، اکثر انگریز اس
تماشے میں مصروف تھے اور آرنلڈ کو بھی اس میں مزہ آتا تھا، لیکن میری کچھ اور
حالت تھی، چونکہ غلطی سے میرا یہ خیال تھا کہ یہاں عموماً عرب آباد ہیں، اس لئے یہ
طبعی بات تھی کہ میں اُن کو عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا، لیکن وہ انعام لینے کے
لئے ایسی مبتذل، ناموزوں اور حقیر حرکات کرتے تھے کہ کسی طرح طبیعت کو گوارا
نہیں ہو سکتا تھا، عبرت ہوتی تھی کہ عرب کی اب یہ حالت ہے کہ غیروں کے سامنے
اس قسم کی حرکات سے ان کو شرم نہیں آتی، ان خیالات سے بے اختیار میرا دل
بھر آتا تھا، یہاں تک کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے اختیار زبان سے
نکلا قم یا عمر، آرنلڈ پاس تھے، میری تغیرِ حالت پر ان کو خیال ہوا، میں نے دل

کی کیفیت اور اسکا سبب جب بیان کیا، ایک بار آنکھ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور چپ ہوگئے
شہر میں جا کر جب میں نے تحقیق کی اور تمام باتوں سے ثابت ہوگیا کہ سمالی قوم عرب نہیں ہے
تو مجھکو کسی قدر تسکین ہوئی، یہی غصہ اور رنج تھا جس کی وجہ سے میں نے قصیدۂ سفریہ میں
اس کمبخت قوم کی سخت ہجو کی ہے، اور در حقیقت وہ اس کے مستحق ہیں،

چونکہ وقت کم تھا اس لئے میں شہر کے اندرونی حصہ کو نہ دیکھ سکا، ہندوستان کو خط
روانہ کئے، ایک خط کے سرنامہ پر یہ اشعار لکھے جو اسی وقت موزوں ہوئے تھے،

چوں کمر بستم بعزم ایں سفر از روی عزم — دشمن و ہم دوست را در پیچ و تاب انداختم
ہر کسی را بس شگفت آمد کہ حاصل چیست ازیں — تا چرا خود را بدیں ساں در عذاب انداختم
ہر یکے پندم ہمی داد و ہمے گفتے کہ من — زیں سخن از عارض معنی نقاب انداختم
چوں لجاجت از حد بردند گفتم بس کنید — ہرچہ بادا باد من کشتی در آب انداختم

عدن کی زبان عموماً عربی ہے، اور پارسی، ہندو، بنگالی جو تجارت یا نوکری کے
ذریعہ سے یہاں رہتے ہیں بے تکلف عربی بولتے ہیں، چونکہ میں نے کبھی کسی ہندو
کی زبان سے اس مقدس زبان کے الفاظ نہیں سنے تھے، بنیوں اور بقالوں کو این
تروح ما تبتغی بولتے دیکھ کر عجب مزہ آتا تھا،

یہان کی زبان گو عربی ہے، لیکن نہایت بیہودہ اور غیر فصیح ہے، اگرچہ آج کل تمام
ان ملکوں میں جہاں عربی بولی جاتی ہے، قدیم عربی نہیں رہی، لیکن عدن کی زبان
سب سے نرالی ہے، دو چار معمولی الفاظ کے سوا میں کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا، غالباً یہان
کی زبان ایک مدت سے اجنبیوں کے اختلاط کی وجہ سے خراب ہوتے ہوتے
اس حالت کو پہنچی ہے، علامہ مقدسی جو عرب کا ایک نامور سیاح گذرا ہے، اور جس نے

چوتھی صدی کے آغاز میں دنیا کا سفر کیا تھا اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے کہ "عدن میں جو قومیں بستی ہیں اُن میں زیادہ اہل فارس ہیں" علامۂ موصوف نے یہ بھی لکھا کہ "یہاں عموماً جیم کے بجائے کاف بولتے ہیں، اور رجلیہ کے بجائے رجلیکہ وعلیٰ ہذا،، جب علامۂ موصوف کے عہد میں یہ حال تھا تو مرہٹوں اور گجراتیوں کے اختلاط کے بعد یہاں کی زبان کی نسبت کیا شکایت ہو سکتی ہے،

عدن میں ایک جرمن ہمارے جہاز پر سوار ہوا، جو جرمنی کے مشہور عجائب خانہ کا ملازم ہے، اور مدت تک ان اطراف میں رہ کر یورپ کو واپس جا رہا ہے، سیاحی و تجارت کی بدولت وہ متعدد زبانوں میں بے تکلف بات چیت کر سکتا ہے، جب وہ جہاز کے افسروں سے اٹالین میں آرنلڈ سے انگریزی میں، مجھ سے عربی میں گفتگو کرتا تھا تو مجھ کو سخت تعجب اور رشک ہوتا تھا، کھانے کی میز پر جب ہم سب جمع ہوتے تھے تو یہی ایک شخص تھا جو سب کا ترجمان بنتا تھا، اس نے عرب و افریقہ کے جنگلوں سے بہت سے عجیب و غریب جانور بہم پہونچائے ہیں، ایک بڑے پنجرے میں افریقہ کے بندر تھے، جن کی ہئیت معمولی بندروں سے کچھ الگ تھی، ان میں زیادہ تر تعجب انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ کسی کو اپنی طرف آتا دیکھکر غل مچاتے تھے تو ان کی آواز سے بعض حروف مفہوم ہوتے تھے، میں نے اولاً خیال کیا کہ ہم لوگ جس طرح مثلاً بلی کی آواز کو میاؤں سے تعبیر کرتے ہیں یہ بھی اسی قسم کے فرضی الفاظ ہیں، لیکن چند بار میں نے غور سے سنا تو صاف صاف ل اور یا یا کی آواز محسوس ہوتی تھی، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص پردے سے سنتا تو ہرگز خیال نہ کر سکتا کہ بندر کی آواز ہے، میں نے مسٹر آرنلڈ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی تصدیق کی، غالباً اسی قسم کی مثالوں سے یورپ میں بعض لوگوں کو خیال

عجیب و غریب بندر

پیدا ہوا ہے کہ بندر بھی بول سکتے ہیں، چنانچہ مشہور رہے کہ ایک صاحب نے مدت کے تجربہ اور تحقیق کے بعد اس زبان کے چند حروف دریافت کئے ہیں،

عدن سے چونکہ دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہو گئے تھے، اسلئے ہم بڑے لطف سے سفر کر رہے تھے لیکن دوسرے ہی دن ایک پُرخطر واقعہ پیش آیا جس نے تھوڑی دیر تک مجھکو پریشان رکھا، ۱۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اُٹھا تو ایک ہمسفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا، میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے، اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے، انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا، اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا، میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے، اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا، دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا، وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے،؟ فرمایا کہ اگر جہاز کو برباد ہی ہونا ہے، تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے، اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے، اُن کے استقلال اور جرات سے مجھکو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا،

۱۳ مئی کو جہاز سویز پہنچا اور تین چار گھنٹے کے لئے ٹھہرا، مصری عرب، پنیر، کھجور، روٹیاں بیچنے کے لئے لائے، ان میں سے ایک نے مجھ کو ہندوستانی خیال کر کے اردو میں باتیں کرنی شروع کیں، مجھ کو تعجب ہوا اور جب دریافت سے معلوم ہوا کہ اس نے کبھی ہندوستان کی صورت نہیں دیکھی، تو اردو کی عالمگیری پر مجھکو اور بھی تعجب

ہوا، ۱۴ ارمئی کو ہم پورٹ سعید پہنچے، اور نہایت افسوس کے ساتھ مجھ کو آرنلڈ سے جدا ہونا پڑا،
بمبئی سے میں نے برنڈزی تک کا ٹکٹ لیا تھا، پورٹ سعید پہنچکر یہ خیال ہوا کہ برنڈزی
تک تو آرنلڈ کا ساتھ ہے، لیکن وہاں سے قسطنطنیہ تک ایک ہفتہ کا سفر ہے، اتنی مدت
تک محض اجنبیوں سے سابقہ اور زبان اور ملک کی اجنبیت کی وجہ سے ہر کام میں وقت
ہوگی، اس خیال کی بنا پر میں نے پہلی اسکیم بالکل بدل دی اور ارادہ کر لیا کہ شام
کے راستہ سے قسطنطنیہ جاؤں گا،

جہاز نے جس وقت لنگر کیا، کگ کمپنی کا ایک ملازم اپنے مسافروں کی خبر گیری کیلئے
جہاز پر آیا، جہاز کنارے سے ذرا فاصلہ پر کھڑا ہوتا ہے، اس لئے مسافروں کے اتارنے
کے لئے کگ کمپنی کی طرف سے ایک چھوٹی سی کشتی ہمیشہ تیار رہتی ہے، ان بندرگاہوں
میں جہاز سے اترتے کے وقت ناتجربہ کار آدمی کو سخت مصیبت پیش آتی ہے جہاز
کے لنگر کرنے کے ساتھ قلی اور ملاح ہر طرف سے ٹوٹ پڑتے ہیں، اور مسافروں
کو سخت پریشان کرتے ہیں، ان کے ہجوم، شور وغل اور اسباب کی چھینا جھپٹی میں
مسافر بالکل بدحواس ہو جاتا ہے، بہزار وقت کنارے پر پہنچا تو گھنٹوں کرایہ کی بحث
اور تکرار رہتی ہے، ان بلاؤں سے محفوظ رہنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ کگ کمپنی کے ملازموں
کے سوا، اور کسی سے کچھ واسطہ نہ رکھے،

ہم کنارے پر پہنچے تو شیمویل نے جو پہلے سے ہمارے انتظار میں کھڑا تھا، بڑھکر
ہم سے شیک ہینڈ کی، یہ شخص قوم کا یہودی ہے، اور کگ کمپنی کی طرف سے مسافروں
کی خبر گیری اور ہر قسم کی مدد دینے کے لئے متعین ہے، وہ متعدد زبانیں جانتا ہے
اور بالخصوص عربی، انگریزی، فرنچ، نہایت بے تکلفی سے بول سکتا ہے، لطف یہ ہے

کہ اردو میں بھی نہایت آسانی سے بات چیت کرسکتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مدت تک ہندوستان میں رہ چکا ہے، ہم اس کے ساتھ دفتر میں گئے، دفتر کا مکان برلب دریا ہے، اور میز کرسیوں سے اچھی طرح آراستہ ہے، میز پر ہمیشہ بہت سے اخبارات موجود رہتے ہیں، جن میں زیادہ تر جہازوں کے متعلق خبریں اور اشتہارات ہوتے ہیں، سب سے پہلے ہم نے اس سے ٹکٹ بدلوانے کی بابت گفتگو کی، یعنی یہ کہ اگر ہم یہاں اُتر جائیں اور قسطنطنیہ کا نیا ٹکٹ لیں تو جو زائد کرایہ ہم برانڈزی تک کا دے چکے ہیں وہ مجرا مل سکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ وہ خود اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا، کمپنی کے بڑے دفتر میں گیا اور وہاں سے واپس آکر کہا کہ تم اسی ٹکٹ سے قسطنطنیہ جا سکتے ہو صرف دو پونڈ یعنی ۳۰ روپے اور دینے ہوں گے، میں بہت خوش ہوا، اور اس کارگذاری کے صلہ میں آٹھ روپئے اس کے نذر کئے، یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ قسطنطنیہ جانے والا جہاز اُس وقت تیار تھا ورنہ پندرہ دن تک پورٹ سعید میں ٹھہرنا پڑتا،

پورٹ سعید

پورٹ سعید ایک چھوٹا سا خوبصورت بندر گاہ ہے، آبادی کے دو حصے ہیں، جو حصہ دریا سے متصل ہے، اس میں عموماً یورپین سوداگر رہتے ہیں اور بہت بڑے بڑے ہوٹل، قہوہ خانے اور تھیٹر وغیرہ ہیں، ایک قہوہ خانہ عین دریا کے کنارے پر ہے، اور بہت ہی پر فضا ہے، نہایت ترتیب کے ساتھ سنگ مرمر کے تختے کی چھوٹی چھوٹی میزیں اور اُن کے گرد کرسیاں لگی ہوئی ہیں، قہوہ، چائے، توس مکھن ہر وقت تیار رہتا ہے، اس حصہ میں کثرت سے دکانیں ہیں، اور نہایت شان دار اور آراستہ ہیں، دوسرے حصہ میں زیادہ تر یہاں کے اصلی باشندے سکونت رکھتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تمام چیزیں نہایت پست حالت میں ہیں، ہوٹل کے بجائے

باورچیوں کی کثیف دکانیں ہیں،

اوّل اوّل جب میں اس شہر کی سیر کو نکلا تو ہر چیز کو بڑے شوق اور استغراب کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے سلطنت اسلامی کی آبادی دیکھی (حرمین شریفین کی زیارت سے گو اس سے پہلے مشرف ہو چکا تھا، لیکن وہ خدا کا ملک ہے، اور میں دنیوی سلطنت اور حکومت کا ذکر کر رہا ہوں) جب کوئی بلند اور شاندار عمارت دیکھتا تو اس خیال سے خوش ہوتا کہ الحمد للہ ان ملکوں میں مسلمان خوش حال اور دولت مند ہیں، لیکن دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ کسی یوروپین سوداگر کا مکان ہے، سارے شہر میں ایک بھی عمدہ دوکان یا بلند عمارت کسی مسلمان کی نہ تھی' افسوس ع

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

البتہ یورپین آبادی کے خاتمہ پر ایک شاہی مسجد ہے، اور وہ بہت پُر رفعت اور شاندار ہے،

تھوڑی دیر بازار میں پھر پھرا کر قسطنطنیہ جانے والے جہاز پر سوار ہوا، شیمویل اور مسٹر آرنلڈ ساتھ تھے، چونکہ بیت المقدس کے حج کا زمانہ تھا، اس لئے فرسٹ اور سکنڈ دونوں درجے عیسائی حاجیوں سے بھرے ہوئے تھے، مسٹر آرنلڈ نے کہا مجھ کو ڈر ہے کہ تم کو تکلیف نہ پہنچے، یہ لوگ مذہب کے سخت پابند ہیں، اور اس لئے ضرور ہے کہ ان میں تعصب ہو، تم غیر مذہب، غیر قوم، تمہاری معیت ان کو کیونکر گوارا ہو گی، لیکن مجھ کو تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ کا خیال صحیح نہ تھا، وہ لوگ پابند مذہب تھے لیکن فرنچ اور اٹالین تھے انگریز نہ تھے، اس کم آمیزی اور فاتح مفتوح کا امتیاز جو فاتح قوم کی مخصوص صفتیں ہیں اُن میں بالکل نہ تھیں، مسٹر آرنلڈ تھوڑی دیر کے بعد

رخصت ہوئے، میں نے ان کو خدا حافظ کہا، اور ساتھ ہی یہ فکر پیدا ہوئی کہ دیکھئے تنہائی میں اب کیونکر گذرتی ہے،

۱۵ رمئی کو جہاز یافہ پہنچا، ہمارے اکثر یورپین ہمسفر یہاں اُتر گئے، بیت المقدس یہاں سے صرف رات بھر کا راستہ ہے، چونکہ وقت کم تھا، اس لئے میں یہاں اتر نہ سکا،

۱۶ رمئی کو بیروت پہنچے، یہاں جہاز عموماً دو پہر سے کم نہیں ٹھہرتا، چونکہ یہ ایک تاریخی مقام اور نہایت قدیم شہر ہے، اس لئے میں اس کے دیکھنے کا بہت شائق تھا، کنارے پر پہنچکر بڑی دقت پیش آئی، کہ وہاں تذکرہ یعنی پروانہ راہداری کے بغیر کسی کو اترنے نہیں دیتے تھے، میں ہندوستان سے اس عجلت میں چلا تھا کہ پاسپورٹ لینے کا موقع نہیں مل سکا تھا، پہلے تو میں بہت گھبرایا کہ افسوس یہ سیر مفت رہی جاتی ہے، لیکن پھر خیال آیا اور میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا، صرف سیر کرنی مقصود ہے، ان لوگوں میں سے ایک نے خدا جانے کیونکر پہچانا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، غریب الوطن سمجھکر مہربانی کی، اور ایک آدمی ساتھ کر دیا کہ یہ شہر کی سیر کرا دے گا،

کی سیر

چونکہ پہلے سے ارادہ تھا کہ قسطنطنیہ سے واپس آتے ہوئے یہاں دو ایک روز قیام کروں گا، اس لئے اس دفعہ صرف سرسری طور پر بازار وغیرہ کی سیر کی کتابوں کی دکانیں دیکھیں، گذرگاہ عام پر ایک قہوہ خانہ تھا، تھوڑی دیر تک وہاں ٹھہرا، اور راہ چلتوں کا تماشا دیکھتا رہا، جب کوئی شخص شان و شوکت کے ساتھ گاڑی یا گھوڑے پر سوار سامنے سے گذرتا تو میں اپنے رہنما سے پوچھتا کہ کون ہے؟ اور اکثر وہ یہ جواب دیتا کہ "عیسائی"

یہاں سب سے زیادہ مجھ کو یہ بات پسند آئی کہ تمام دکاندار اور پیشے والے، حتیٰ کہ قلی اور مزدور بھی نہایت خوش وضع اور پاکیزہ لباس تھے، تین چار گھنٹے اِدھر اُدھر پھر کر واپس آیا، ایک اٹھنی رہنما صاحب کی نذر کی اور اُن سے رخصت ہو کر جہاز پر پہنچا،

پورٹ سعید سے حالت سفر میں ایک تغیر،

پورٹ سعید سے سفر کی حالت میں جو تجدد ہوا، وہ یہ تھا کہ بمبئی سے پورٹ سعید تک جہاز پر کوئی مسلمان نہ تھا، یہاں پہنچکر دو ایک مسلمان نظر آئے، اور بیروت میں تو سارا جہاز شامی عربوں سے بھر گیا، بدقسمتی سے فرسٹ اور سکنڈ کلاس کو تو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی لیکن تیسرے درجے میں ہر طرف مسلمان ہی مسلمان تھے، میں شروع سفر سے مسلمانوں کی صورت کو ترس گیا تھا، یہ مجمع دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی ہوئی فرسٹ کلاس کی چھت نہایت صاف اور پُر فضا جگہ تھی، اور میں اکثر وہیں بیٹھ کر دریا کی سیر کیا کرتا تھا، لیکن جب یہ صحبت نصیب ہوئی تو میں نے بھول کر بھی ادھر قدم نہیں رکھا،

اوّل اوّل مجھ کو ان لوگوں سے میل جول پیدا کرنے میں سخت وقت پیش آئی یہ لوگ چھت پر جا بجا پھیلے ہوئے تھے اور دو دو چار چار آدمیوں کی جماعتیں تھیں میں بڑے شوق سے اُن کے پاس گیا، لیکن وہ مطلقاً متوجہ نہ ہوئے، جس شخص کے پاس کھڑا ہوا اس نے ایک بار آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن نیچی کر لی مجھ کو اس بداخلاقی پر سخت تعجب ہوا دل میں کہتا تھا کہ عربوں کی مہمان نوازی کی یہ کچھ تعریفیں سنی تھیں، ان کو تو بات چیت میں بھی مضائقہ ہے، ان میں مدرسہ احمدیہ کے چند طلبہ تھے، جو رخصت لے کر وطن میں آئے تھے اور اب قسطنطنیہ جا رہے تھے، وہ کبھی دل بہلانے کے لئے عربی دیوان پڑھا کرتے تھے، میں نے خیال کیا کہ ہمفنی کے ذریعہ سے تعارف پیدا کروں، چنانچہ ان کے پاس گیا اور دخل در معقولات کے طور پر اپنی مولویت اور

علمیت جتانی شروع کی، وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے، میں اپنا سامنہ لیکر چلا آیا، لیکن مجھ کو یقین تھا کہ اس واقعہ کا ضرور کوئی خاص سبب ہے، اتفاقاً ایک موقع پر ایک شخص نے میرا مذہب پوچھا، میں نے کہا، "اسلام"، بولا واللہ اھذا طربوش المسلم، یعنی "ہرگز نہیں، کہیں مسلمان ایسی ٹوپی اوڑھتے ہیں"، بدقسمتی سے میرے سر پر ایرانی ٹوپی تھی اور اس وجہ سے تمام عرب مجھکو مجوسی سمجھتے تھے، یہ معما جب حل ہوا تو میں نے ان لوگوں کے دل سے اس بدگمانی کو رفع کر دیا، اور پھر وہ ایسے شیر و شکر ہوئے کہ ایک دم کو مجھ سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے، مدرسۂ حربیہ کے طلبہ سے زیادہ صحبت رہتی تھی، قسطنطینیہ کے متعلق میں نے بہت سی ضروری باتیں ان سے دریافت کیں، اور درحقیقت ان معلومات سے مجھ کو بہت فائدہ ہوا،

اس بات کا اثر کہ اب ہم اسلامی دنیا میں ہیں جہاز پر بھی محسوس ہوتا تھا، بمبئی سے سویز تک تھرڈ کلاس کے مسافروں کے ساتھ قلیوں کی طرح برتاؤ کیا جاتا تھا، لیکن ان ممالک میں یہ حالت بالکل بدلگئی، جہاز کے افسر اور ملازم عموماً یورپین ہیں، ان مسافروں کو دل میں جو کچھ سمجھتے ہوں، لیکن ظاہر میں ان سے کوئی برابرتاؤ نہیں کر سکتے تھے، متعدد موقع پیش آئے، جن میں میں نے دیکھا کہ زیادتی مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوتی تھی، لیکن افسران جہاز کو اغماض کرنا پڑتا تھا،

۱۰ مئی کو جہاز سائپرس[۱] پہنچا، یہ ایک مختصر سا جزیرہ ہے، جو بحر روم میں واقع ہے اور جس کو عربی میں قبرس کہتے ہیں، یہ جزیرہ اسلام کی قدیم فتوحات کی یادگار ہے،

---

[۱] جغرافیہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ زمانہ قدیم میں اس جزیرہ میں نو صوبے، بارہ شہر، آٹھ سو پانچ گاؤں، ۱۰ لاکھ باشندے تھے، ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں اس پر قبضہ کیا، اب باشندے ستر ہزار ہیں، یہاں کی شراب نہایت مشہور ہے، اور حریر بھی عمدہ ہوتا ہے،

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ۲۷ھ میں امیر معاویہ نے اس پر حملہ کیا، شہر والوں نے اس پر صلح کی کہ جس طرح ہم سلطنت روم کو خراج دیتے ہیں تم کو بھی سات ہزار دو سو دینار سالانہ دیا کریں گے اور تم میں اور رومیوں میں کبھی جنگ ہوگی تو ہم کو کسی سے واسطہ نہ ہوگا، امیر معاویہ نے یہ شرط قبول کرلی لیکن ۳۲ھ میں ان لوگوں نے خلافِ عہد مسلمانوں کے مقابلہ میں رومیوں کو مدد دی، امیر موصوف نے پانسو کشتیوں کے بیڑے کے ساتھ دوبارہ چڑھائی کی اور نہایت آسانی سے فتح کرلیا تاہم تعداد خراج اور صلح کی شرطیں وہی رہنے دیں، ان کے حکم سے بارہ ہزار عرب وہاں جاکر آباد ہوئے اور مکانات اور مسجدیں تعمیر کیں، ایک مدت کے بعد یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا اور کئی بار فتح ہو ہو کر پھر نکل گیا، سب سے اخیر ترکوں نے ۱۵۷۰ء میں عیسائیوں سے واپس لیا، اور اب تک انہی کے قبضہ میں تھا، روم و روس کی اخیر جنگ میں انگریزوں نے اس شرط پر لیا کہ سالانہ خراج جو سلطان کو ملتا تھا، اب بھی ملتا رہے گا، چنانچہ اب وہاں انگریزی حکومت اور انگریزی انتظام ہے،

اس جزیرہ میں لرنکہ اور لماسول دو بڑے شہر ہیں اور دونوں جگہ جہاز تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے لنگر کرتا ہے، میں نے لماسول کی سیر کی، چونکہ یہاں انگریزی حکومت ہے، اس لئے راہداری کے پروانہ کی پرسش وجہ نہ تھی، میں داخل ہوا تو میرے سر پر ایرانی ٹوپی اور بدن میں شروانی اچکن تھی، غالباً وہاں کے لوگوں نے یہ وضع کبھی دیکھی نہ تھی، میں جدھر سے گذرتا، لوگ تعجب سے دیکھتے اور کہیں کھڑا ہو جاتا تو تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی، سب سے پہلے میں جامع مسجد میں گیا، مسجد کے متصل ایک مکتب ہے، وہاں ایک مولوی صاحب جو نہایت باوقار اور خوش لباس تھے، ابتدائی صفوں کو درس

دے رہے تھے، میں نے سلام علیک کی، وہ کھڑے ہوگئے، اور نہایت مہربانی سے سلام کا جواب دیکر بیٹھنے کا اشارہ کیا، لڑکے تپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ان کی برابر بیٹھ گیا، مولوی صاحب کے اشارہ سے ایک لڑکے نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، میرے دل پر عجیب اثر ہوا، خیال آتا تھا کہ کہاں وہ حجاز کا ریگستان! کہاں بحر روم کے دور دراز جزیرے، اس مقدس کلام (قرآن) میں کیا تاثیر تھی کہ مشرق سے مغرب تک برقی قوت بن کر دوڑ گئی اور آج تک باقی ہے، وہ معصوم لڑکا خوش لحن بھی تھا، اور اصول قرأت کے مطابق پڑھتا تھا، اتفاق سے آیتیں بھی موثر تھیں، ان باتوں نے مجھ کو بالکل مدہوش کر دیا اور دیر تک ایک عجیب حالت طاری رہی،

اگرچہ پندرہ سولہ برس سے انگریز یہاں حکومت کر رہے ہیں، لیکن حکمت عملی کے لحاظ سے طرز انتظام میں بہت سی قدیم باتیں قائم رکھی ہیں، محکمہ قضا بالکل الگ ہے اور شرعی مقدمات سے حکومت انگریزی کو کچھ واسطہ نہیں، اتفاق سے مجھ کو قاضی صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا، بہت خلیق اور باوقار آدمی ہیں، تعلیم کا طریقہ بھی بالکل ترکی انتظام کے مطابق ہے، تمام مکتبوں اور مدرسوں میں ترکی سررشتۂ تعلیم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جس مکتب کا میں نے ابھی ذکر کیا اس میں قرآن مجید، فقہ کا ابتدائی رسالہ، تاریخ، جغرافیہ درس میں داخل ہے، اور تعلیم نہایت خوبی سے ہوتی ہے قسطنطنیہ سے واپسی کے وقت بھی میں اس مکتب میں گیا تھا، صبح کا وقت تھا، اور مدرس صاحب اُس وقت تک تشریف نہیں لاچکے تھے، دو تین لڑکے موجود تھے، وہ نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، ایک نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا وطن کہاں ہے، میں نے کہا ہندوستان، بولا، ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، خاص شہر کا نام بتایئے، میں نے

علی گڈھ کا نام لیا کہنے لگا، میں نقشہ میں دیکھتا ہوں، کہاں واقع ہے، ہندوستان کا نقشہ سامنے آویزاں تھا، اُس نے ایک سرسری نگاہ ڈالی اور فوراً علی گڈھ پر انگلی رکھ کر کہا "ہاں یہ ہے"، اس کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی، اس لئے مجھ کو اسکی اس تیزی اور یادداشت پر تعجب ہوا، میں نے پوچھا تمھارا بادشاہ کون ہے' بولا آفندم' آفندی ترکی زبان میں جناب مخدوم کے ہم معنی ہے، اور جب میم متکلم کے ساتھ استعمال کیا جائے تو عموماً اس سے سلطان مراد ہوتے ہیں، میں نے کہا "یہاں تو انگریز حکومت کر رہے ہیں"، بولا کہ "ہاں مستاجری کے طور پر لیا ہے، اور سالانہ خراج ادا کرتے ہیں"، انگریزوں کی حکمت عملی نہایت دانشمندانہ ہے کہ کسی ملک پر قبضہ کرتے ہیں، تو اس تدریج اور آہستگی سے کہ ملک والوں کو انقلاب حکومت کی خبر بھی نہیں ہوتی،

یہاں کی زبان ترکی ہے، اور یہاں سے قسطنطنیہ تک ہر شہر اور قصبہ کی یہی زبان ہے، اس سے ترکوں کی حکومت کی سطوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ممالک مفتوحہ کی زبان تک بدل دی، ایشیاے کوچک اتنا بڑا وسیع ملک ہے، اور کثرت سے عیسائی آباد ہیں، جن کی زبان کسی زمانہ میں یونانی یا لیٹن تھی، لیکن اب تمام ملک میں ترکی بولی جاتی ہے، سیپرس کے مولوی صاحب اور قاضی صاحب جن کا میں نے ذکر کیا اگرچہ عربی بخوبی جانتے تھے، لیکن بول نہیں سکتے تھے، البتہ معمولی جملے سمجھ لیتے تھے اور اسی سہارے پر میں نے اُن سے بات چیت کی تھی،

مجھ کو اس قدر قلیل زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت کا صحیح اندازہ تو کیا ہو سکتا تھا، لیکن ظاہر طور سے قیاس ہوتا تھا کہ اچھی نہیں، جس قدر بلند مکانات یا عمدہ دکانیں نظر آئیں، دریافت سے معلوم ہوا کہ کل عیسائیوں کی ہیں،

۱۸ رمئی کو جہاز رودس پہنچا اور تین چار گھنٹے ٹھہرا، یہ چھوٹا سا جزیرہ ہے، جس کی وسعت ہمارے قدیم مورخوں نے ساٹھ میل بیان کی ہے، اور جغرافیہ مترجمہ سوسائٹی علی گڈھ میں طول چالیس میل اور عرض پندرہ میل لکھا ہے، یہ بھی قدیم فتوحات میں سے ہے، امیر معاویہ کے عہد میں ۵۲ھ میں فتح ہوا، اور اسی وقت بہت سے مسلمان وہاں جاکر آباد ہوئے، قدامت کے لحاظ سے میں اس کی سیر کا مشتاق تھا، لیکن بد قسمتی سے رات کا وقت تھا، اور جہاز والوں میں سے اور کسی نے میرا ساتھ نہ دیا، زیادہ بد قسمتی یہ کہ واپسی کے وقت بھی اتفاق سے یہی اسباب پیش آئے، اور اُس کی سیر سے بالکل محروم رہ گیا،

۲۰ رمئی صبح کے وقت ازمیر پہونچے، چونکہ یہ ایک بہت بڑا بندرگاہ ہے، جہاز دو روز تک یہاں مقیم رہا، میں اپنے شامی دوستوں کے ساتھ جہاز سے اُترا، کنارہ پر وہی تذکرہ (پروانہ راہداری) کی بازپرس تھی، لیکن ساتھیوں کی بدولت مجھ کو چنداں زحمت نہیں ہوئی، یہ شہر جس کو انگریزی میں سمرنا کہتے ہیں، ایشیاے کوچک کا صدر مقام ہے اور اس صوبہ میں اس سے زیادہ وسیع اور آباد کوئی شہر نہیں ہے، قدامت اور تاریخی واقعات کے لحاظ سے بھی ایک یادگار مقام ہے، ہومر جو یونان کا مشہور شاعر گذرا ہے، اور جس کی نسبت یورپ کا خیال ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا، اسکی قبر یہیں ہے، سات مقدس گرجے جن کا ذکر انجیل کے سفر رویا میں ہے، ان میں سے ایک اسی شہر میں تھا، زمانہ کے انقلابات نے اس کو دس دفعہ تباہ و برباد کیا، تاہم اسکی موجودہ آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے، اطراف کی زمین نہایت سیر حاصل ہے، اور خود شہر تجارت کا بہت بڑا امرکز ہے، ہمیشہ بیسیوں دُخانی اور بادبانی جہاز بندرگاہ

یں موجود رہتے ہیں، ریل بھی یہاں جاری ہے، اور دو وقت یہاں سے ٹرین روانہ ہوتی ہے،

اسلامی آثارات بکثرت ہیں، لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ مسجدوں کی تعداد تین سو سے کم نہیں، جن میں بعض بڑی شوکت و شان کی ہیں،

جہاز سے ہم اُترے تو نہایت بلند اور شان دار عمارتوں کا سلسلہ نظر آیا، جو دور تک بخطِ مستقیم دریا کے کنارے کنارے چلا گیا ہے، یہ عمارت ہوٹل، قہوہ خانے، تھیٹر، ناچ گھر، اور عیسائی تاجروں کی دکانیں ہیں اور نہایت خوش منظر اور پُرفضا ہیں رات کے وقت ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میلہ یا شادی کی تقریب ہے، قہوہ خانوں، اور ناچ گھروں کے علاوہ سڑک پر کثرت سے مجمع رہتا ہے، اور جدھر جاؤ نغمہ و سرود کی آواز آتی ہے، اس سلسلۂ عمارات کے عقب میں عیسائیوں کا محلہ ہے، اور اس قدر بلند اور عالی شان عمارتیں ہیں کہ میں نے اب تک کہیں نہیں دیکھیں، اس محلہ کے تمام گلی کوچے نہایت صاف اور ہموار ہیں،

اس محلہ کی سیر سے فارغ ہو کر میں نے شہر کا رخ کیا، شہر اگرچہ نہایت پُررونق ہے اور آدمیوں کی کثرت سے ہر وقت ایک میلہ سا معلوم ہوتا ہے، لیکن تمام سڑکیں ناہموار و ناصاف ہیں اور گلی کوچوں میں تو نجاست اور کیچڑ کی وجہ سے رستہ چلنا مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں میونسپلٹی کا انتظام نہایت خراب ہے، اور حکومت ترک کے لئے یہ ایک نہایت قابلِ لحاظ امر ہے، چلتے چلتے ہمارے شامی دوستوں کو بھوک لگی اور ایک نان بائی کی دوکان پر جا بیٹھے، مجھ کو اگرچہ اشتہا نہ تھی، لیکن ان کے اصرار سے شریک ہوا، نان بائی کے لفظ سے ہمارے ناظرین کو ہندوستان کے

نان بائیوں اور اُن کی ذلیل دُکانوں کا خیال آیا ہوگا، لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، یہاں معمولی سے معمولی دکان کی آراستگی کی یہ صورت ہے کہ متعدد چھوٹی چھوٹی میزیں اور ان کے گرد کرسیاں لگی ہیں، میزوں پر نہایت صاف چادر بچھی ہوئی ہے، دیوار کے ایک کونے میں ٹونٹی لگی ہے، اور اس کے نیچے طشت اور دائیں طرف صابون اور تولیہ رکھا ہے، یہ نہایت معمولی دکانوں کی کیفیت ہے، اور بڑی بڑی دکانیں جن کو ہوٹل کہا جا سکتا ہے نہایت پُرتکلف اور پُرشان ہیں، لیکن اس قسم کے جس قدر ہوٹل ہیں عموماً عیسائیوں کے ہیں،

میں نے مدرسوں کی سیر کرنی چاہی، لیکن چونکہ جمعہ کا دن تھا، تمام مدرسے بند تھے، نماز جمعہ جامع حصار میں پڑھی، یہ مسجد پرتکلف اور آراستہ ہے، چھت پر طلائی نقش و نگار ہیں، بڑی خوبی یہ ہے کہ صحن کے دونوں طرف بڑے بڑے ستونوں پر گھنٹے لگے ہیں جن سے اوقاتِ نماز معلوم ہونے کے ساتھ مسجد کی زیبایش بھی ہے، ہمارے ہندوستان میں اس کی تقلید کی جاتی تو اچھا ہوتا، خطبہ و نماز میں یہاں بعض جدتیں ہیں، مگر نہ شریعت میں ان کی کچھ اصل ہے نہ بجائے خود وہ موزوں ہیں، خطیب جب خطبہ پڑھتا ہے تو بیچ بیچ میں رکتا جاتا ہے، اُس وقت چند اشخاص آواز ملا کر کچھ پڑھتے ہیں، یہ چپ ہوتے ہیں تو خطیب پھر شروع کرتا ہے، اور اس طرح کئی بار اتفاق ہوتا ہے، نماز میں عموماً چھوٹی سورتیں پڑھتے ہیں جو تین چار آیتوں سے زیادہ نہیں ہوتیں، حالانکہ تمام دنیا میں جمعہ کی نماز میں بڑی سورتوں کے پڑھنے کا دستور ہے،

نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں کتب خانہ میں گیا، یہ کوئی بڑا کتب خانہ نہیں ہے، مسجد کے کونے میں ایک چھوٹا سا حجرہ ہے، اور کتابوں کی تین چار چھوٹی چھوٹی الماریاں

ہیں، نماز کے بعد اکثر علماء اور اربابِ تصانیف یہاں آ بیٹھتے ہیں، جس وقت میں پہنچا، اصحاب ذیل تشریف فرما تھے، مولانا مصطفےٰ آفندی امام جامع مسجد و مدرس مدرسہ صبری آفندی، مدرس مدرسۂ اعدادی، مولانا سعید، تسکری بک حسنی آفندی سابق مہتمم تعلیمات، سلام علیک اور مزاج پرسی کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ ابھی ایک مسئلہ کے متعلق گفتگو کرتے تھے، اگر آپ پسند کریں تو وہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے، میں نے خوشی سے منظور کیا، متعہ کے متعلق بحث تھی، اور وہی مشہور شبہہ پیش تھا کہ خود حضرت عمرؓ کے قول سے ثابت ہوتا ہے کہ متعہ کا طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانِ حیات تک جاری تھا، میں نے کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی، اور تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا، یہ لوگ عربی نہیں سمجھتے تھے، اس لئے میں فارسی میں گفتگو کرتا تھا، ان ملکوں میں بحث و مذاکرہ کا یہ طریقہ عموماً رائج اور نہایت شائستہ طریقہ ہے، اجنبی شخص کو علما کے گروہ سے ملنے اور اُن سے ربط و اختلاط پیدا کرنے کا اس سے زیادہ آسان اور مفید کوئی ذریعہ نہیں، بڑی خوبی یہ ہے کہ مناظرہ نفسانیت اور ترفع کے لحاظ سے نہیں ہوتا، بلکہ اثنائے تقریر میں اگر ان کو اندازہ سے معلوم ہو جاتا ہے، کہ مخاطب اعتراض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو قصداً دوسرا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں، اس قسم کی علمی مجلسیں اس سفر میں میری کامیابی کا بڑا ذریعہ تھیں، اور بعض جگہ تو انہی کی بدولت مجھ کو ایسی دشواریوں سے نجات ملی جن سے رہائی کی اور کوئی تدبیر نہ تھی،

۱۲؍ مئی کو شام کے قریب جہاز نے لنگر اُٹھایا، یہاں سے قسطنطنیہ تک کوئی بڑا اسٹیشن نہیں ہے، بعض بعض مقامات پر جہاز تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرا، لیکن ہم اتر نہ سکے، یہ مقامات زیادہ تر جنگ کی ضرورتوں کے لئے ہیں، اور ہر جگہ کثرت

سے جنگی آلات فراہم ہیں، چناق قلعہ ایک مقام ہے، جہاں نہایت مضبوط قلعہ ہے لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ فتح کرنے کا عزم کیا تو اُس وقت توپ اور گولے کا عام رواج نہ تھا، محمد نے خود توپیں ڈھالیں اور مٹی کا گولہ بنوایا، جن میں سے چند یادگار کے طور پر اب بھی محفوظ ہیں، یہ گولے پختہ اور نہایت مضبوط ہیں، اور بیان کیا جاتا ہے کہ لوہے کے گولوں سے کم نہیں، ازمیر سے قسطنطنیہ تک دریا کے دونوں طرف ایسے محفوظ قلعے اور دمدمے طیار کئے گئے ہیں اور اور اس کثرت سے سامانِ جنگ موجود ہے، کہ قوی سے قوی سلطنت بھی اس راستے سے دار السلطنت پر حملہ کرنے کا قصد نہیں کر سکتی، یہ تمام قلعے اور دمدمے محمد فاتح کے عہد کے ہیں، یہ نامور شہنشاہ جب قسطنطنیہ کی تسخیر کے ارادہ سے بڑھا تو راہ میں جابجا جنگی چھاؤنیاں بنوائیں اور قلعے اور دمدمے تیار کرائے، لیکن یہ تمام تفصیل لوگوں کی زبانی روایت ہے، میں نے تاریخ سے اسکی تصدیق نہیں کی ہے،

چناق قلعہ سے آگے بڑھکر ہم نے ایک عجیب تماشا دیکھا جہاز تیزی سے جارہا تھا کہ دور سے پانی میں ایک فوارہ سا چھوٹتا نظر آیا، تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سامنے سے چار پانچ مچھلیاں جہاز کی طرف دوڑی آرہی ہیں، قریب آگئیں تو جہاز کے ساتھ ہولیں، ان کا جسم پانی کی سطح سے صاف نظر آتا تھا، جہاز اگرچہ نہایت تیزی سے جارہا تھا لیکن وہ برابر ساتھ ساتھ آتی تھیں، کبھی کبھی جب سانس چڑھ جاتی تھی تو بڑے زور سے پھنکار مارتی تھیں، اُس وقت پانی میں فوارہ سا چھوٹتا نظر آتا تھا، قریباً دو تین میل تک جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑیں، تمام لوگ حیرت سے تماشا دیکھتے تھے بعضوں کو خیال ہوا کہ ان مچھلیوں نے کبھی جہاز کی صورت نہیں دیکھی تھی، اسلئے اس کو کوئی جانور

سمجھیں اور مقابلہ کے جوش میں چاہتی تھیں کہ جہاز ان سے بڑھنے نہ پائے، واپسی کے وقت بھی ایسا ہی اتفاق ہوا، اور اس وقت دریافت سے معلوم ہوا کہ اس مقام پر ایک دفعہ اتفاق سے یہ مچھلیاں آگئی تھیں اور جہاز کے ملازموں نے اُن کے لئے کھانے کی کوئی چیز دریا میں ڈال دی تھی، اسی کی طمع پر جب کوئی جہاز اُدھر سے گذرتا ہے تو اکثر یہ مچھلیاں آجاتی ہیں اور دور تک جہاز کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہیں،

۱۳ مئی صبح کے وقت قسطنطنیہ پہنچے، جہاز نے لنگر کیا، یہ ایسا وقت تھا کہ مجھ کو منزل مقصود پر پہنچنے کی نہایت خوشی ہونی چاہئے تھی لیکن قلیوں اور ملاحوں کے ہنگامے اور شور وغل میں میرے حواس جاتے رہے، ملاحوں نے تمام جہاز گھیر لیا، ان کے شور وغل اور کشاکش سے ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا، میں نے پہلے سے کچھ طے نہیں کیا تھا، اور نہ کر سکتا تھا کہ جہاز سے اتر کر کہاں جاؤں، ہوٹل میرے مناسب حال نہ تھا (اس کی وجہ آگے چل کر معلوم ہوگی) اور سراؤں پر ناواقفیت کی وجہ سے اطمینان نہیں ہو سکتا تھا، سخت مصیبت یہ ہوئی کہ شامی احباب جن سے ہر قسم کی مدد کی توقع ہو سکتی تھی، ان کو کالجوں میں پہنچنے کی جلدی تھی، اس لئے وہ میرا انتظار نہ کر سکے، مجھ کو اکیلا پاکر ملاحوں اور قلیوں نے اور بھی دق کرنا شروع کیا، میرا اضطراب اس خیال سے اور بڑھتا جاتا تھا کہ جہاز پر زبان کی اجنبیت کی وجہ سے یہ وقت ہے تو شہر میں کیا حال ہوگا،؟ اس لیت ولعل میں زیادہ دیر ہوتی جاتی تھی، اکثر مسافر جہاز سے اُتر گئے، اور اُترتے جاتے تھے، آخر خانساماں کو اسباب سپرد کیا اور اس سے کہا کہ میں شہر کی سیر کر کے واپس آتا ہوں، مقصد یہ تھا کہ پہلے شہر میں جا کر قیام کا انتظام کر آؤں تب اسباب جہاز سے اُتاروں، شام کے چند عربوں نے ایک کشتی کرایہ کی تھی، میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا، کنارے پر تذکرہ

کی پرس وجو تھی، میں نے انگریزی چھٹیاں دکھائیں لیکن وہ پاسپورٹ مانگتے تھے، غرض بہزار دقت رہائی ہوئی اب حیران تھا کہ کہاں جاؤں، ایک شامی عرب سے جن کا نام عبد الفتاح تھا کشتی میں تعارف ہو گیا تھا، میں نے ان سے اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ "آپ مجھ کو کوئی معقول طریقہ بتائیں" انھوں نے کہا کہ "میری حالت بھی تمھارے قریب قریب ہے، اسلئے بہتر یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ رہیں" یہ طریقہ اگرچہ احتیاط کے خلاف تھا، لیکن ناواقفیت اور اجنبیّتِ زبان کی وجہ سے مجبوراً اختیار کرنا پڑا، اور سچ پوچھئے تو یہی اتفاقی معیت میری تمام کامیابیوں کا دیباچہ تھی،

یہاں مسافروں کے ٹھہرنے کے چند طریقے ہیں، سب سے زیادہ اطمینان اور آرام تو ہوٹلوں میں ہے، لیکن اولاً تو ان کا کرایہ ایک پونڈ یعنی عـہ۱۲ روزانہ سے کم نہیں، دوسرے اکثر بلکہ قریباً تمام عمدہ ہوٹل یورپین آبادی میں ہیں، جو استنبول سے دور ہے، اور جامع مسجدیں کتب خانے، مدرسے، مکاتب جس قدر ہیں سب استنبول میں ہیں،

ہوٹل کے بعد خانات یعنی سرائیں ہیں، لیکن یہ سرائیں ہندوستان سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، یہاں بڑی بڑی سراؤں میں جس قدر کمرے ہوتے ہیں عموماً وسیع اور پرفضا ہوتے ہیں، اور ان میں ہر وقت نواڑ کا پلنگ، توشک، چادر لحاف اور اور ضروری چیزیں مہیا رہتی ہیں، ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ ہوتے ہیں، فی پلنگ آٹھ دس آنہ کرایہ ہوتا ہے،

تیسرا طریقہ کرایہ کے مکانات ہیں، یہ مکانات اکثر دو منزلے سہ منزلے ہوتے ہیں، ہر درجہ میں متعدد کمرے اور ہر کمرے میں، میز، کرسی، کوچ، لمپ، فرش، پلنگ، توشک، لحاف، تکیہ مہیا رہتا ہے، کرایہ فی کمرہ دس روپیہ ماہوار سے بیس تیس تک ہوتا ہے، ان

ان مکانوں کے مالک یا اجارہ دار عموماً عیسائی ہیں، وہ خود بھی انہی مکانوں میں رہتے ہیں
اور اُن کی وجہ سے مسافروں کو بہت کچھ آرام ملتا ہے،
اگرچہ جیسا میں نے ابھی بیان کیا کرایہ کا مکان لینا زیادہ آرام کا طریقہ تھا لیکن
میں اور میرے شامی دوست دونوں اس طریقہ سے ناواقف تھے، اس لئے ایک خان
یعنی سرائے میں جاکر ٹھہرے، اس انتظام کی طرف سے اطمینان ہوا تو جہاز پر جاکر اپنا اسباب
اٹھوا لایا، چھ سات دن تک ہم اس خان میں رہے، پھر باب عالی کے پاس ایک عمدہ
مکان کرایہ پر لے لیا،
خوش قسمتی سے شیخ عبدالفتاح جن کے ساتھ میں نے زبردستی دوستی پیدا کی تھی،
بڑے معزز خاندان کے آدمی نکلے، دمشق میں حضرت خالد نقشبندی ایک بزرگ گذرے
ہیں جن کے ساتھ یہاں کے لوگوں کو اس قدر ارادت ہے کہ ان کا نام نہیں لیتے۔ بلکہ
حضرت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ بزرگ ہمارے خاکِ ہندوستان کے تربیت یافتہ
یعنی حضرت میرزا جان جاناں دہلوی کے مرید تھے، شیخ عبدالفتاح انہی کے بھتیجے
ہیں، اور اس تعلق سے لوگ اُن کی قدر و منزلت کرتے ہیں، چونکہ قسطنطینیہ میں شامیوں کا
ایک بڑا گروہ ہے، دو ہی چار روز میں شیخ عبدالفتاح کی اکثر لوگوں سے
شناسائی ہو گئی اور ان کے ذریعہ سے مجھ کو بھی ان لوگوں سے تعارف ہوتا گیا،
ایک دن شیخ علی ظبیان جن کے والد ایک مشہور صوفی ہیں، شیخ عبدالفتاح سے ملنے
آئے میں بھی اس وقت موجود تھا، اور اتفاق سے رسالہ اسکات المعتدی جو میری قدیم
تصنیف ہے، اور عربی زبان میں ہے، سامنے رکھا ہوا تھا، انھوں نے اٹھا کر دیکھا، اور
کہا کہ "اہا یہ رسالہ مدت ہوئی میں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا، تو انھوں نے

اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا "شکر اللہ مساعیہ"۔ شیخ علی ظبیان کو جب معلوم ہوا کہ وہ رسالہ میری ہی تصنیف ہے تو اٹھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے اور نہایت لطف و مہربانی سے پیش آئے، مجھ کو اس بات سے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہونچی، اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا نہایت مسرت ہوئی اور سفر کی کس مپرسی میں اتنا ذریعۂ تعارف بہت غنیمت معلوم ہوا، شیخ علی ظبیان نوجوان آدمی ہیں، فقہ کی تحصیل شیخ عبدالرحمن سے کی ہے جو مصنف رد المحتار (مشہور بہ شامی) کے نواسے اور شاگرد تھے، اگرچہ ان کو اکثر علومِ متداولہ میں دخل ہے، لیکن ادب میں زیادہ مہارت ہے، ایک غیر منقوطہ قصیدہ سلطان کی مدح میں پیش کیا تھا، جس پر ان کو صلہ و انعام بھی عطا ہوا، مدت سے درویش پاشا کے مہمان ہیں، اور پاشائے موصوف اُن کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ رکھتے ہیں، مجھ سے ان کا تعلق روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ باوجود بعدِ مسافت قریبًا ہر روز میرے مکان پر تشریف لاتے اور کبھی کبھی تمام دن میرے پاس رہتے، شیخ عبد الفتاح چند روز کے بعد دمشق کو واپس چلے گئے، اس وقت تنہائی میں شاید مجھ کو تکلیف پہونچتی، لیکن شیخ علی ظبیان کی غمگساریوں نے تمام ترددات دل سے دور کر دیئے،

مکان جو ہم نے کرایہ پر لیا تھا، اگرچہ نہایت خوش فضا اور موزوں تھا، لیکن چونکہ مکان کا مالک (عارضی) نہایت بدمعاملہ اور آوارہ مزاج تھا، چند روز کے بعد میں نے دوسرا مکان کرایہ پر لیا اور اخیر تک وہیں رہا، یہاں مکان کی خوبی کے ساتھ بڑا آرام یہ تھا کہ مالکِ مکان ایک نیک مزاج عورت تھی، اگرچہ اس کا مذہب عیسائی تھا اور قوم کی اٹالین تھی، تاہم بقدر ضرورت عربی بول لیتی تھی، اور مسلمانوں سے ایک خاص

اُنس رکھتی تھی،

کھانے پینے کے انتظام کی ہم کو کچھ ضرورت نہ تھی، ہوٹل اور دکانیں کثرت سے ہیں اور نہایت مرتب اور پُر تکلف ہیں، بازار میں کھانا یہاں مطلق عیب نہیں، میں نے اکثر معزز عہدہ داروں کو ہوٹلوں میں کھاتے دیکھا، یہ ہوٹل عموماً عیسائیوں کے ہیں، مسلمانوں کی دوکانیں بجز اس کے کہ میز و کرسی وہاں بھی ہوتی ہے، باقی اور باتوں میں ہندوستان کی دکانوں سے مشابہ ہیں،

جہاز پر جو میں نے قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا، قسطنطینیہ پہونچ کر تمام ہوا، اس میں سفر کے حالات کا اجمالی خاکہ ہے، اور چونکہ ناظرین تمام حالات کی تفصیل سے واقف ہو کر قصیدہ کے قصہ طلب حوالے بخوبی سمجھ سکیں گے، اور ان کو زیادہ لطف و مزہ آئیگا، میں اس قصیدہ کو بتمامہ یہاں نقل کرتا ہوں،

قصیدہ

بہر تکمیلِ فن و ہم پے تحصیلِ عبر — روزگاریست کہ میداشتم آہنگِ سفر
فارغ از حج و زیارت چو مرا کرد خدائے — خواستم تا بسوے روم شوم راہ سپر
گرچہ من گرم طلب بودم و بس مستعجل — لیک تاخیر ہمی رفت بہ فرمان قدر
دیر آں مایہ شد آخر کہ حسوداں گفتند — کہ فلاں جز ہوسِ خام ندارد در سر
روم گوئی دو سہ گام است کہ ایں خام طمع — بے تکلف بسفر چیست ببست است کمر
رہ چنیں دور و دراز و سفر ایں مایہ خطیر — چوں میسر شود آں را کہ نہ زور ست و نہ زر
من دریں غصہ و غم خونِ جگر می خوردم — ناگہاں شاہدِ مقصود در آمد از در؟

اتفاقی عجبے گشت مرا عقدہ کشائے | کہ از وہم و گماں نیز نمی داشت خبر

یک دو مہ بیشترک زانکہ زنم کوسِ رحیل | بودم از زحمتِ تپ خستہ دل و تفتہ جگر

چوں ستوہ آمدم از تپ بدل آمد کہ مرا | چارہ جز نقلِ مکاں ہیچ نباشد ایدر

عزم دیرینہ بیاد آمد و گفتم چہ خوش است | کہ بیک حیلہ دو تا کار برآرد داور

آرنلڈ آنکہ رفیق است و ہم اُستاد مرا | ہم دریں عرصہ بانگلنڈ ہمی خواست سفر

گفتم ایں صحبت و ایں واقعہ نادر افتد | پس بعزمِ سفر از جائے بجستم مضطر

چوں ازیں داعیہ ام دم ہمہ آگہ گشتند | ہم بیاران و عزیزانِ وطن رفت خبر

ہمہ را مہرِ بجنبید و بدرد آمد دل؟ | جملہ گفتند کہ ایں زحمتِ بیصرفہ مبر

دل بہجراں منہ و رسمِ وفا را مگذار | ور نخواہی کہ کشی پائے ازیں راہ گزر

روزکے چند بیاسائے وبسیش سازیدہ | سازو برگِ سفر آں گونہ کہ باشد درخور

باخود از نقد و ہم از امتعہ آں مایہ بگیر | کہ اگر دیر بمانی نبود ہیچ خطر

مصلحت نیست کہ ایں مرحلہ تنہا سپری | لاجرم خادمکے نیز بہمراہ ببر

گفتم ایں جملہ کہ گفتند بود عین صلاح | لیک طالب نبود در گروِ نفع و ضرر

مرد ایں مرحلہ گامے کہ فرا پیش نہاد | باز پس مے نہ کشد گر ہمہ مرگ آرد بر

الغرض از رمضان بست و ششم بود کہ من | گرم برخاستم از جائے و شدم راہسپر

اوفتادم برہِ کوہ و بیاباں یک چند | پس بکشتی بنشستم من و یارانِ دگر

زحمتے صعب کشیدیم بکشتی دو سہ روز | بسکہ از موج بہر لحظہ شدی زیر و زبر

کس نیارست سرش باز گرفت از بالیں | کس نیارست جدا کرد تنش از بستر

نبود مایۂ آزار بکشتی چیزے | غیر ازیں محنتِ سہ روزہ کزو نیست مفر

نان خورش بود ز ہر گونہ مہیا ما را ‌‌ ‌‌ از کبابِ برهٔ و مرغ و مے و نقل و شکر

گرچہ من زاں می پالودہ نیالودم لب ‌‌ ‌‌ دیگراں لیک علی الرغم زدندے ساغر

ہفتمِ ماہ مئی چوں برسیدیم عدن ‌‌ ‌‌ کشتی آسود و بینداخت زمانے لنگر

من فرود آمدم و روے بشہر آوردم ‌‌ ‌‌ تا خبر جوئیم ازیں مملکت از بدو حضر

کوہساریست کہ ہر چند بلندست و فراخ ‌‌ ‌‌ لیک از سبزہ و گل نیست درو ہیچ اثر

ہر کجا می گذری ریگ و لانست و خزف ‌‌ ‌‌ ہر طرف می نگری خاک سیاہست و حجر

گبر و ترسا کہ نزیل اند دریں بقعہ ہمہ ‌‌ ‌‌ بزبانِ عربی حرف زدندی یکسر

مردمِ شہر کہ خود را بہ سمالی نامند ‌‌ ‌‌ حیوان اند نہ بل از حیواں ہم بدتر

خوار و بدبخت و تبہ کار و سیہ چردہ و زشت ‌‌ ‌‌ سفلہ و ممتہن و کج روش و بدگوہر

خویشتن را بہ عرب بستہ و حاشا کہ عرب ‌‌ ‌‌ ایں چنیں خوار و زبوں شان بپسندد داور

چوں زبانِ ہمہ تازی بود و ہم چہ عرب ‌‌ ‌‌ نامِ شاں بستہ بود بالقبِ جدّ و پدر

عامیاں در غلط افتند و گماں باز برند ‌‌ ‌‌ کہ مگر در نسب و نسل ز سعد اند و مضر

تخم و ہم ریشۂ ایں نخل ز خاکِ حبش است ‌‌ ‌‌ کہ دریں جائے ببار آمد و افشاند ثمر،

شانگہ گشتے ما باز برفتار آمد ‌‌ ‌‌ تا بیک ہفتہ گذر کرد ز بحر الاحمر

بہ سویز آمد و استاد و چناں زود گذشت ‌‌ ‌‌ کہ ز کیفیت و حالش نشدم ہیچ خبر

ایں ہماں نہرِ عجیبست کہ زنیساں کاری ‌‌ ‌‌ جز در افسانۂ پاریں نہ شنیدیم دگر

بیست فرسنگ درازست و بہ پہنا چنداں ‌‌ ‌‌ کہ دو والبور توانند ازو کرد گذر

مردی از اہلِ فرنسا کہ لیسپش نام است ‌‌ ‌‌ زدہ ایں نقش و در اقصائی جہاں گشت سمر

آں خرد دور چو در آغاز بدعوی برخاست ‌‌ ‌‌ کہ تواں آمدن از عہدہ ایں کار بدر

مرد ماں سخرہ گرفتندش و گفتند کہ ایں ... ہرزہ ہست کہ فرزانہ ندارد باور

از مئی چاردہم بود کہ در پورٹ سعید ... برسیدیم و نشستیم بہ وابورِ دگر

درمیانِ من و آرنلڈ بیفتاد فراق ... ز انکہ راہِ من و او گشت جدا زیں معبر

پورٹ جائیست کہ تا چشم ونگہ کار کند ... زورق و کشتی و وابور بود سر تا سر

صد بہ بینی کہ برافراشتہ اینجا رایت ... صد بہ بینی کہ درانداختہ آنجا لنگر

شامگہ کشتی ما باز رواں گشت و گذشت ... از رہِ یافہ و لیں کرد بہ بیروت مقر

من بساحل شدم و مردی از ابنائے حلب ... ہمرہم گشت و بہر ناحیہ ام شد رہبر

خوب جائیست کہ تا خواستہ درباز دول ... ہر کہ سوزی بدلش دارد و دردی بجگر

موضعی خرم و سیرے خوش و جائے دلکش ... راہ ہموار و زمیں پاک و مکاں خوش منظر

گبر و مسلم ہمہ خوش جامہ و موزوں اندام ... خاص و عامی ہمہ گلگوں تن و زیبا پیکر

جامہاشاں بعرب ماند و درزی و لباس ... ہیچ فرقے ز مسلماں نبود تا کافر

چوں بروں رفتم ازیں جائے از آں چارہ نبود ... پیش و میر فتم و بازم بقفا بود نظر

از مئی شانزدہم بود کہ گشتیم رواں ... پس بہ قبرس برسیدیم ہنگامِ سحر

ایں ہمہ جائے قدیمیست کہ در عہد امیر ... سپہے رفت بہ تسخیرش و زد فالِ ظفر

حالیا دولت انگلینڈ گرفتش از ترک ... لیک با صلح نہ از یاوری تیغ و تبر

مسجد جامع و ایوانگہِ قبرس دیدم ... سیر ایں بقعہ مرا بس عجب افزود و عبر

رہوڈس و سکز برہ آمد و زاں پس ازمیر ... کشتے استاد بہ ازمیر و شبی بر دسبر

من سوی شہرِ رواں گشتم و یک یک دیدم ... مسجد و مکتب و بازار و رہ و کوچہ و در

فرض آدینہ ادا کردم و از بعد نماز ... در کتب خانۂ سلطانیم افتاد گزر

مجلسے از فقہا بود در آں جا و بہم — بحث از متعہ ہمیرفتُ ہم از قولِ عمرؓ
زاں یکے رو بمن آورد کہ چونی چہ کسی — تا چرا بر زدہُ دامنِ محنت بکمر
گفتم از ہندم و از خوانِ ادب لہ ربائے — طرفے مے برم از ہر جہت و ہر کشور
گفت حالا سخن از متعہ ہمیرفتُ و تو ہم — گر توانی سخنے گوے و مثالے آور
من بپاسخ در معنے زدم و مستعمال — لب بتحسیں بکشادند پس از بحث و نظر
پس ز ازمیر رواں گشتم و در عرض دو روز — طے شد این راہ و بیاباں برسید ایں دفتر
مختصر گفتہ ام ایں حرف و تو ہم میدانی — کہ دریں بادیہ بس تنگ بود راہِ گزر

ہر کہ جویا بود از حالِ من و رحلۂ من
بایدش گفت کہ ایں نظم بخواند یکسر

قسطنطنیہ کی اجمالی تاریخ اور مختصر حالات

قبل اس کے کہ میں یہاں کے تفصیلی حالات جدا جدا عنوان سے بیان کروں ضرور ہے کہ نہایت مختصر طور پر اس کی قدیم تاریخ اور اس کے ساتھ اس کی عام موجودہ حالت اجمال کے ساتھ بیان کروں، اس شہر کی ابتدائی تاریخ (یعنی جب وہ بزنطائن کے نام سے پکارا جاتا تھا) نہایت قدیم ہے، جس زمانہ سے اس کا نام قسطنطنیہ ہے اسکو بھی کچھ کم عرصہ نہیں گذرا، ۳۲۶ء میں قسطنطین اعظم نے اس کی بنیاد ڈالی، اور اس وقت سے محمد فاتح کے زمانہ تک قیصرانِ روم کا پایۂ تخت رہا، انگریزی اور حال کے انگریزی اور حال کے اسلامی جغرافیوں میں اس کے حالات نہایت تفصیل سے ملتے ہیں، قدیم اسلامی جغرافیوں میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن ابن بطوطہ کے سوا مجھکو کوئی اسلامی مصنف معلوم نہیں جس نے اس زمانہ کے واقعات چشم دید لکھے ہوں، ابن بطوطہ نے ۱۵ء میں اس شہر کو دیکھا، اس وقت یہاں عیسائی حکومت تھی، وہ لکھتا ہے کہ "یہ نہایت عظیم الشان شہر ہے، اور ایک نہر کے حائل ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے، ایک حصہ جو شہر کے مشرقی کنارے پر ہے، استنبول کہلاتا ہے اور قیصر روم اور ارکانِ دولت و امراسی حصہ میں رہتے ہیں، دوسرا حصہ غلطہ کے نام سے موسوم ہے، اس میں عموماً یورپ کے بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں، جن کو قیصر بزور اپنی اطاعت میں رکھتا ہے، ابن بطوطہ نے ان سوداگروں کی وسعتِ تجارت کی تعریف اور ان کے نچلے پن کی ہجو کی ہے، وہ

لکھا ہے کہ "جب میں اس شہر میں داخل ہوا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے علاوہ قریباً سو بڑے بڑے جہاز موجود تھے، لیکن تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے، اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں[1]"

مسلمانوں نے قرنِ اوّل ہی میں اسکو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ سب سے اوّل جس نے اس کی شہر پناہ کے آہنی دروازے پر تلوار ماری وہ عبداللہ بن المطلب، خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار تھا، اس کے بعد اور خلفاء و سلاطین نے بھی اس پر حملے کئے، لیکن قیصرانِ روم کا خاتمہ محمد فاتح کے ہاتھ سے ہونے والا تھا، جس نے ۸۵۷ھ میں اس عظیم الشان دار السلطنت پر صلیب کے بجائے علمِ اسلام بلند کیا، اس حیرت انگیز معرکہ کی یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ عیسائیوں نے بندرگاہ کا راستہ دریا کی طرف سے روک رکھا تھا، ترکوں نے باسفورس اور گولڈن ہارن کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہے، اس پر پانچ میل تک لکڑی کے تختے بچھا دیئے اور جہازوں کو جن میں پہیئے لگائے تھے، اس پر چلا کر تمام فوجیں گولڈن ہارن میں اُتار دیں، اس وقت اس نامور فاتح کی عمر کل ۲۳ برس تھی، اس فتح کا مادۂ تاریخ "بلدۂ طیبہ" ہے،

موجودہ حالت

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ جو دور تک چلی گئی ہے، یہ شہر اس کے دو کناروں پر آباد ہے، اور اس وجہ سے اس کے دو حصے بن گئے ہیں، ایک حصہ استنبول کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں، کتب خانے، سلاطین کے مقبرے اسی حصہ میں ہیں، مسلمان کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے، دوسرا حصہ پیرہ سے شروع ہوتا ہے، اور اس کے انتہائی جانب پر بکطاش وغیرہ واقع ہیں، جہاں سلطان کا ایوانِ شاہی اور قصرِ عدالت ہے، پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے، اور چونکہ تمام بڑے بڑے

[1] ابن بطوطہ کے بیان کو ہم نے اس لحاظ سے نقل کیا ہے کہ موجودہ حالت سے موازنہ کر سکیں،

یورپین سوداگر اور سفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں، اس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے،

کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کے برابر خوش منظر نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ منظر کے لحاظ سے اس سے زیادہ خوشنما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا، اسی لحاظ سے اس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی شاخِ زریں کہتے ہیں، کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے، اور دور تک چلا گیا ہے، عمارتوں کے آگے جو زمین ہے وہ نہایت ہموار اور صاف ہے، اسکی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے، اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے،

شہر کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانچ سو جامع مسجدیں، ۱۷۱ حمام، ۴۳۲ سرائیں، ۱۶۴ مدارس قدیم، ۵۰۰ مدارس جدید، ۱۲ کالج، ۵۴ کتب خانے، ۳۰۵ خانقاہیں، ۸۴ چھاپے خانے ہیں، کاروبار اور کثرتِ آمدرفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں، بارہ دخانی جہاز، زمین کے اندر کی ریل، معمولی ریلیں (جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں) ہر وقت چلتی رہتی ہیں، اور باوجود اس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے، غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پُل ہے، اُس پر سے گذرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے، اُس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے،

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں، میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں، جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں، قہوہ خانوں

میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چاے و قہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے، اکثر قہوہ خانے دریا کے
ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں جن کے لئے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے، قہوہ خانوں میں روزانہ
اخبارات بھی موجود رہتے ہیں، لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں، قسطنطنیہ
بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریاتِ زندگی میں محسوب ہیں، میرے عرب احباب
جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں تو تعجب سے کہتے تھے،
بایش یتسلون یعنی وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں، ان ملکوں میں دوستوں کے ملنے جلنے
اور گرمیِ صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں،

افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں، وہ جانتے ہی نہیں کہ اس
قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کس قدر ضروری ہیں، اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا
کیا اثر پڑتا ہے، دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی ہیں جس کا طریقہ یہ ہے، کہ کسی دوست
کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں، لیکن اس طریقہ میں دو بڑے نقص
ہیں، اوّلاً تو تفریح کے جلسے پُر فضا مقامات میں ہونے چاہئیں، کہ تازہ اور لطیف ہوا
کی وجہ سے صحتِ بدنی کو فائدہ پہنچے، دوسرے سخت خرابی یہ ہے کہ چونکہ یہ جلسے
پرائیوٹ جلسے ہوتے ہیں، اس لئے اُن میں غیبت شکایت اور اس قسم کی لغویات
کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا، بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمعِ عام کی وجہ سے
اس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا، قسطنطنیہ اور مصر میں میں ہمیشہ شام کے
وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا، لیکن میں نے کبھی اس قسم
کے تذکرے نہیں سُنے، تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا
اور نہ ہو سکتا تھا،

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی کو یوروپین اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو تو یہاں دیکھ سکتا ہے، کتب فروشوں کی دوکانوں کی سیر کرو تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے، سنگِ خام کا فرش ہے، شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں، کتابیں جس قدر ہیں مجلد ہیں، جلدیں بھی معمولی نہیں بلکہ عموماً مطلّا و مذہب مالکِ دوکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے، دو تین کم سن خوش لباس لڑکے ادھر اُدھر کام میں لگے ہیں، تم نے دکان میں قدم رکھا ایک لڑکے نے کرسی لاکر سامنے رکھدی، اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی، قیمت فہرست میں مذکور ہے، اور اُس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں،

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجایش نہیں، قیمت چکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے،

اسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دُکانیں دونوں نمونہ کی موجود ہیں، عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے، غلطہ کو دیکھو تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے، دُکانیں بلند اور آراستہ، سڑکیں وسیع اور ہموار، کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں، بخلاف اس کے استنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے، اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل،

اس شہر میں آکر ایک سیاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا، وہ یہ ہوگا کہ اس عظیم الشان دار السلطنت کے دو حصوں میں اس قدر اختلافِ حالت کیوں ہے، چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا، میں نے اِس کے متعلق

بہت کچھ بحث و تفتیش کی، باشندوں کے اختلافِ حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کرلیا، یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا تموّل، لیکن سڑکوں اور گذرگاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پا سکتا تھا، اس لئے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنی حسین حسیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ ہماری مینوسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں، بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں، لیکن غلطہ میں یوروپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں، اس لئے مینوسپلٹی ان رقموں کو فیاضی سے صرف کرسکتی ہے، مجھے خیال ہوا کہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے، یا اب ان کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے کہ اس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے،

عمارتوں کی و[ضع]

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں، مکانات عموماً سہ منزلہ چومنزلہ ہیں، صحن مطلق نہیں ہوتا، عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں، بڑے بڑے امرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہاں

آتش زدگی

اکثر آگ لگتی ہے، کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہ ہوں، اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں، آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے کہ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں، ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے، جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں، کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں فوراً خبر کریں، اس قسم کے اور بھی

چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوئے ہیں، جس وقت کہیں آگ لگتی ہے، فوراً توپیں سر ہوتی ہیں، اور شہر کے ہر حصہ سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہونچ جاتے ہیں، ان کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں، یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُن کی جھپٹ میں آکر پس جائے، تو کچھ الزام نہیں، میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں، معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے، اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے،

آب وہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے، جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہی، اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے، گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا، اس قدر خوش گوار ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا، تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امراء شملہ اور نینی تال کے بجائے قسطنطینہ کا سفر کیوں نہیں کرتے، پانی پہاڑ سے آتا ہے، اور نہایت ہاضم اور خوش گوار ہے،

ہر قسم کے میوے کثرت سے ہیں، اور خصوصاً انگور اور خربزہ بے مثل ہوتا ہی، لکھنؤ کے خربزے لطافت میں تو شاید بڑھ کر ہوں، لیکن شیرینی میں یہاں کے خربزوں کی برابری نہیں کر سکتے، امرود جن کو اہلِ عرب انجاس کہتے ہیں، عجیب مخروطی شکل کے ہوتے ہیں، رنگ میں تو نہیں لیکن صورت میں گاجروں سے مشابہ مگر نہایت شیریں اور لذیذ، سیب کابل کے سیب سے بڑے اور زیادہ شیریں، ایک میوہ یہاں ہوتا ہے، جس کو مشمش کہتے ہیں، وہ ہمارے یہاں کی جامن سے کچھ مشابہ ہے، ہر قسم کے میوے نہایت ارزاں ہیں، انگور ۲ سیر تک آتے ہیں، سیب عمدہ سے عمدہ پیسے کے دو دو علی ہذا،

لباس اور وضع

لباس اور وضع بالکل یورپین ہو، ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہو سکتا، لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی لباس ہو سکتا ہے عیسائی اور یہودی بھی استعمال کرتے ہیں، اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں، یہ طریقہ ایک اعتبار سے تو اچھا ہے کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں میں اختلاف کے آثار جس قدر مٹتے جائیں تمدن کے لئے مفید ہے، لیکن سوشل ضرورتوں میں اس سے سخت ہرج ہوتا ہے، مجھ کو اس کی وجہ سے اکثر دشواریاں پیش آئیں، اور ہمیشہ خیال آتا تھا، کہ حضرت عمرؓ نے اگر عیسائیوں کو قومی لباس کی پابندی کا حکم دیا تو بہت بجا کیا، تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ، یعنی علمار اور مدرسین بھی یورپ کے اثر سے نہیں بچ سکے ان کے پائجاموں میں تپلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں، صرف یہ فرق ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے، اور خوبصورتی کے ساتھ چنٹیں ہوتی ہیں، کرتہ یا اچکن کے بجائے صرف واسکوٹ ہوتا ہے، واسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں، اور یہی امتیازی علامت ہے جو ان کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے، اس میں بھی یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے واسکوٹ کھلا رہتا ہے، ٹرکی ٹوپی عموماً یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر سپید کپڑے کی ایک دھجی لپٹی ہوتی ہے، جس کو عربی میں لفہ کہتے ہیں، اور وہ اہل علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے، عورتوں کے لباس کی تفصیل میں عورتوں کی تہذیب و معاشرت کے ذکر میں لکھوں گا،

جامع اور شاہی ایوانات

یہاں کی عمدہ اور یادگار عمارتیں، جامع مسجدیں اور شاہی ایوانات ہیں، جامع مسجدوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ جداگانہ عنوان سے آگے آئیگا،

شاہی ایوانات کو یہاں سرائے کہتے ہیں، ان کی تعداد بیس یا اکیس ہے، اور سب دور دور فاصلے پر واقع ہیں، یہ عمارتیں مختلف سلاطین کے عہد کی ہیں، اور نہایت عظمت و شان کی عمارتیں ہیں، ایک ایوان عین لبِ دریا ہے، جو سر تا پا سنگِ رخام کا ہے، اور نہایت وسیع، بلند، خوشنما ہے، حال میں شہنشاہِ جرمنی سلطان کا مہمان ہوا تھا تو اسی ایوان میں ٹھہرا تھا،

یہ بات نہایت تعجب کی ہے کہ تمام شہر میں کوئی ٹاؤن ہال نہیں، پبلک گارڈن یعنی باغِ عامہ بھی ایسا مختصر ہے کہ اس عظیم الشان دار السلطنت کے لئے کسی طرح موزوں نہیں،

عدالتیں (بجز دو تین کے) سب یکجا واقع ہیں اور اس مجموعی عمارت کو بابِ عالی کہتے ہیں، وزیر اعظم کا محکمہ بھی یہیں ہے، یہ عمارتیں چنداں شان دار نہیں ہیں، ہائی کورٹ جس کو یہاں محکمۂ التمیز کہتے ہیں، بابِ عالی سے فاصلہ پر ہے، میں اس کے اندر تو نہیں گیا، لیکن باہر سے بڑی شاندار عمارت معلوم ہوتی ہے، پولس کمشنر کی عدالت غلطہ میں ہے، میں نے اس کی اچھی طرح سیر کی، عمارت چنداں قابلِ ذکر نہیں ہے، لیکن نہایت مرتّب اور آراستہ ہے، اجلاس کے کمرہ میں بیش قیمت ترکی قالین بچھا ہوا ہے، کرسیاں بھی نہایت خوبصورت اور موزوں ہیں، معارف یعنی سررشتۂ تعلیم کا محکمہ بھی میں نے دیکھا، معمولی عمارت ہے، لیکن صفائی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی ہے،

ترقی تعلیم کالج اور اسکول

ترقی تعلیم

اس دور دراز سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ اگر میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تھا، تو یہاں کی طرزِ تعلیم اور ترقیِ تعلیم کا اندازہ کرنا تھا، چنانچہ میں نے اس پر بہ نسبت اور تمام باتوں کے زیادہ توجہ کی، اور جہاں تک ہو سکا کوشش اور محنت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن ناظرین کو یہ امید نہ کرنی چاہئے کہ میں اپنے مقاصد میں پورا کامیاب بھی ہوا، اور یہ کہ میری تعلیمی رپورٹ کوئی مکمل رپورٹ ہوگی، تحقیقات کے لئے میں جو کوشش کر سکتا تھا وہ یہ تھیں کہ چند بار سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں گیا، افسرانِ تعلیم سے تحقیق طلب باتیں دریافت کیں، بڑے بڑے کالج اور اسکول خود جا کر دیکھے، ٹیچروں اور پروفیسروں سے ملا، کالجوں کی سالانہ رپورٹیں حاصل کیں، لیکن یہاں ان تمام کوششوں پر بھی پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، ترکوں میں یہ عجیب دستور ہے کہ وہ ہر ایک بات کو پالٹیکس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس وجہ سے کسی معاملہ کا منظر عام میں آنا پسند نہیں کرتے، سررشتۂ تعلیم کی رپورٹ جو سالنامہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے، نہایت مختصر اور محض مجمل ہوتی ہے، یہاں تک کہ مصارفِ تعلیم اور پروفیسروں اور ٹیچروں کی تنخواہوں کا ذکر تک نہیں ہوتا، بعض بعض کالجوں مثلاً مکتب حربیہ، مکتب سلطانی کی جداگانہ رپورٹیں شائع ہوتی ہیں، لیکن ان میں نتائجِ امتحان اور نصابِ تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا،

اوّل اوّل مجھ کو خیال ہوا کہ چونکہ میری رسائی کے وسیلے کم تھے، اس لئے یہ حالات کم معلوم ہو سکے، لیکن جب میں نے خیر الدین پاشا وزیر ٹونس کی کتاب پڑھی تو تسکین ہو گئی، اس نے جہاں ترکی کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تمدنی و تعلیمی ترقیوں کا حال لکھا ہے، نہایت اجمال سے کام لیا ہے اور یہ معذرت کی ہے کہ "میں نے ترکی کے جو حالات لکھے وہ انگریزی کتابوں کے ذریعہ سے لکھے اور اس وجہ سے مفصل نہ لکھ سکا، لیکن مسلمانوں کی تحریرات میں اس قدر بھی نہیں مل سکتا"، اس تمہید اور معذرت کے بعد میں اصل مطلب شروع کرتا ہوں،

قسطنطنیہ بلکہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں تعلیم کے ۲ دو طریقے ہیں، قدیم وجدید، قدیم تعلیم، ترکی حکومت کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی، چنانچہ آرخان المتوفی سنہ ۷۶۱ھ نے جو اس سلسلہ کا دوسرا بادشاہ تھا، ازنیق میں ایک مدرسہ قائم کیا، یہ پہلا مدرسہ تھا جو ممالکِ عثمانیہ میں قائم ہوا، آرخان کے بعد اور سلاطین نے حوصلۂ شاہانہ سے تعلیم پر توجہ کی اور سیکڑوں دار العلوم اور مدرسے قائم کئے، چنانچہ ہمارے رسالہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، نئی تعلیم کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب ترکی حکومت ایشیائی قالب چھوڑ کر یورپین قالب میں آئی، اس انقلاب کا بانی سلطان محمود تھا، جس نے اوّل اوّل یورپین وضع اختیار کی، اور فوج کو یورپ کے طرز پر آراستہ کیا، اسی مجدد نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں مکتب حربیہ کی بنیاد ڈالی جو تعلیم جدید کا پہلا کالج تھا، یہ کالج اب بھی موجود ہے، اور تمام حربی مدارس کا مرکز ہے، سلطان محمود کے بعد سلطان عبد المجید نے سنہ ۱۲۶۱ھ میں جدید تعلیم کو زیادہ وسعت دی اور مکاتبِ رشدیہ قائم کئے، اس

عہد سے اب تک یہ تعلیم نہایت وسعت کے ساتھ جاری ہے، اور روز افزوں ترقی کر رہی ہے تعلیم جدید کے چار درجے قرار دیئے گئے ہیں،

ابتدائی تعلیم

ابتدائیہ، اس کی مدتِ تعلیم زیادہ سے زیادہ پانچ برس ہے، لیکن ذہین اور ہوشیار طالب علم دو تین برس بلکہ برس دو برس میں ہی اس کو ختم کر کے اوپر ترقی کر سکتا ہے، اس میں قرآن مجید، ترکی زبان، عربی کا املا، خط، حساب تقسیم تک سکھایا جاتا ہے،

رشدیہ

رشدیہ، مدتِ تعلیم تین برس، اس میں ترکی املا، مفردات زبان ترکی، نحو ترکی، عقائد اسلام بزبان ترکی، حساب چاروں حصے، فرنچ زبان، عربی زبان، جغرافیہ، اقلیدس، کاغذات تجارت کے اصول، نقشہ کشی کی تعلیم ہوتی ہے، یہ درجہ تقریباً ہمارے یہاں کے مڈل کے برابر یا اس سے کچھ بڑھکر ہے،

اعدادیہ اور اسکے طلبہ کی تعداد

رشدیہ کے بعد اعدادیہ ہے، جس کو انٹرنس کہا جا سکتا ہے، اس کلاس کے طالب علموں کی مجموعی تعداد ۱۸۹۲ء میں ۵۲۱۵ تھی، اس میں تمام اضلاع اور خود پایہ تخت کے مدارس شامل ہیں،

اعدادیہ کے بعد خاص خاص کالج ہیں، مثلاً مکتب ملکیہ، مکتب الحقوق وغیرہ جن کا مفصل بیان آگے آئے گا، ہر قسم کے عام و خاص مدرسے جو قسطنطنیہ میں ہیں، ان کی تعداد پانسو ہے، جن میں ۱۳ بڑے بڑے کالج ہیں،

سلطان حال کے زمانہ میں تعلیم کی ترقی

یہ امر عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ سلطانِ حال کے عہد میں تعلیم نے نہایت ترقی کی ہے، اور روز بروز کرتی جاتی ہے، سلطان کی تخت نشینی کے وقت مدارسِ رشدیہ کی تعداد ۹۷ تھی، لیکن اب ۴۰۵ ہے، ہر قسم کے نئے مدارس جو سلطان کی شانزدہ سالہ حکومت میں قائم ہوئے، اُن کی تعداد دو ہزار ہے، اس کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں طالبعلموں

کی تعداد اس کثرت سے بڑھتی جاتی ہے، کہ ترقی تعلیم کے سالِ ماقبل کی رپورٹ سال مابعد سے کچھ نسبت نہیں رکھتی، پروفیسر ویمبری نے اب سے چند برس پہلے ترکوں کی عام ترقی پر جو لکچر دیا، اس میں مکتب الحقوق (قانونی کالج) کے طالب علموں کی تعداد تین سو بیان کی ہے، لیکن جب میں قسطنطنیہ میں تھا تو اس کالج میں بارہ سو طالب علم موجود تھے، میں نے زمانۂ قیامِ مصر میں قاہرہ کے مشہور اخبار المؤید میں پڑھا تھا، کہ "سلطانِ حال نے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، تو مصارفِ تعلیم تین لاکھ پونڈ سالانہ تھے، لیکن اب آٹھ لاکھ پونڈ سالانہ ہیں" یہ رقم ہمارے یہاں کے ایک کرور بیس لاکھ کے مساوی ہے،

حقیقت میں سلطان کو تعلیم کے ساتھ عجیب دلچسپی ہے، مکتب ملکیہ اور مکتب الحقوق جو قسطنطنیہ کے نامور کالج ہیں خاص سلطان کے قائم کردہ ہیں حضرت ممدوح کو ان کالجوں کی طرف یہ التفات ہے کہ چند بار بنفس نفیس ان کے معائنہ کو تشریف لا چکے ہیں،

جس زمانہ میں میں قسطنطنیہ میں تھا، حضرت ممدوح نے تمام بڑے بڑے کالجوں کے طالب علموں کی شاہانہ دعوت کی، قسطنطنیہ میں کاغذخانہ ایک مشہور سیرگاہ ہے جہاں ہفتہ میں ایک بار تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے، یہ مقام دعوت کے لئے تجویز کیا گیا، اور حکم ہوا کہ ہر کالج کے لڑکے باری باری وہاں بلائے جائیں، سب سے پہلے مکتب حربیہ، پھر مکتب ملکی (سول سروس کالج) اور دوسرے کالجوں کے طلبہ مدعو ہوئے، طالب علم کالج سے چلتے تھے تو سلطان کے حکم کے موافق شاہی بینڈ ان کے آگے آگے بجتا جاتا تھا، چونکہ مصالحِ ملکی کی وجہ سے سلطان خود ان جلسوں میں شریک

نہیں ہو سکتے تھے، ہمیشہ ان کی طرف سے ایک وزیر شریکِ دعوت ہوتا تھا، اور طالب علموں کو سلطان کا سلام پہونچاتا، اُس وقت تمام طالب العلم بڑے جوش اور اخلاص سے **بادشاہم چوق یشا** کا نعرہ بلند کرتے تھے، (یعنی ہمارا بادشاہ بہت زندہ رہے)

تعلیم کے صیغہ میں ایک نہایت مفید ایجاد جو حال میں سلطان کی خاص تجویز سے ہوئی، وہ **مکتب العشائر** کا قائم ہونا ہے، اگرچہ اس وقت تمام ممالکِ عثمانیہ میں تعلیم کو ترقی ہے، لیکن اب تک عرب کے قبائل اس فیض سے قریبًا بالکل محروم تھے، جس کی وجہ خود اُن کی بے پروائی اور بدویت تھی، اس ضرورت سے سلطان نے خاص قبائلِ عرب کی تعلیم کے لئے ایک کالج اور اس کے ساتھ ایک وسیع اور مرتب بورڈنگ قائم کرنے کا حکم دیا، میرے زمانہ قیام ہی میں حکام اور عمال کے نام فرامین صادر ہوئے تھے کہ حجاز، یمن، دیار بکر، بصرہ، بغداد، طرابلس الغرب، حلب، موصل، شام میں عرب کے جو معزز قبائل ہیں ان کے لڑکے انتخاب کر کے بھیجے جائیں، سلطان نے ان کے ہر قسم کے مصارف حکومت کی طرف سے دینے منظور کئے، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو یہ کالج بڑی شوکت و شان کے ساتھ کھولا گیا، اور افتتاحی رسمیں ادا کی گئیں، عربوں کی تہذیب و تربیت کے لئے ایسی عمدہ کوشش کی نظیر تمام اسلامی تاریخ میں نہیں مل سکتی،

اس سے بھی زیادہ شاہانہ فیاضی کا ثبوت **دار الشفقہ** سے ملتا ہے، جو خاص یتیموں کے لئے قائم ہوا ہے، اس مدرسہ میں ایک ہزار یتیم تعلیم پاتے ہیں اور

سب کے سب بورڈر ہیں، اس گروہ کثیر کے، خوراک لباس اور تمام دوسرے ضروری مصارف کا بار سررشتہ تعلیم پر نہیں بلکہ سلطان المعظم کی ذاتِ خاص پر ہے،

کالجوں اور اسکولوں میں سے جو زیادہ تر قابلِ ذکر ہیں وہ یہ ہیں،

مکتب حربیہ شاہانہ مکتب سلطانیہ مکتب ملکیہ	چونکہ میں نے ان کالجوں کو خود دیکھا ہے اور انکے طریقۂ تعلیم وغیرہ کے متعلق تفصیلی حالات دریافت کئے ہیں، اسلئے آگے چل کر انکو جداگانہ عنوان سے لکھونگا
مکتب الحقوق (یعنی قانونی کالج)	اس کالج میں مضامینِ ذیل پڑھائے جاتے ہیں، فقہ، اصول فقہ، رومن لا، قانون تجارت، اصول محاکمہ، تعزیرات، قانون بحری، پولیٹکل اکانومی، یعنی سیاست مدن، قوانین سلطنتہائے یورپ، مختصر طور پر قانون کی ایجاد کی تاریخ اور اس کے عہد بعہد کی ترقیاں، طالب علموں کی کل تعداد بارہ سو ہے، جن میں چھ سو بورڈر ہیں، یہاں کے تعلیم یافتہ منصف اور صدر الصدور وغیرہ ہو سکتے ہیں، مدتِ تعلیم چار برس ہے،
مکتب الہندسہ	مدتِ تعلیم چھ برس، یہ رڑکی کالج کے مشابہ ہے،

مکتب اللسان	اس میں جرمن، فرنچ، یونانی، ارمنی، لاٹین، اٹالین، روسی زبانیں سکھائی جاتی ہیں،
مکتب الصناعة (یعنی ٹکنیکل اسکول)	اس کا سالانہ خرچ ۲۵۰ پونڈ یعنی ۰ ۳۷۵۰ روپیے ہیں، طالب علموں کی تعداد ۲۴۰ ہے اور یہ کل یتیم لڑکے ہیں، ان کے مصارف خود مدرسہ کے فنڈ سے ادا ہوتے ہیں، اس میں اب تک حدادی، نجاری وغیرہ سکھائی جاتی تھی، لیکن سال گذشتہ میں مہتمم مدرسہ توفیق بک آفندی نے درخواست کی کہ کلوں کا کام سکھایا جائے،
مکتب نواب	یہ کالج نہایت عمدہ اصول پر قائم کیا گیا ہے زمانۂ ماقبل میں قاضی و مفتی جو مقرر ہوا کرتے تھے، ان کے لئے کسی قسم کی خاص تعلیم میں امتحان دینا مشروط نہ تھا، اب یہ قاعدہ قرار دیا گیا ہے، کہ جو شخص اس کالج کا تعلیم یافتہ نہ ہو وہ شرعی مناصب پر مقرر نہیں ہو سکتا، اس طریقہ نے سعی سفارشوں کی تقرریوں کا راستہ بالکل مسدود کر دیا ہے، اس کالج میں فقہ کی نہایت

	اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے، تعلیم جدید کی بعض چیزیں بھی اضافہ کی گئی ہیں، تاکہ موجودہ زمانہ کی ضروریات پر واقفیت ہو،
مکتب بحریہ	اس میں فن جہاز رانی کی تعلیم ہوتی ہے،
مکتب الزراعۃ	اس میں کاشتکاری کی تعلیم ہوتی ہے،

طریقۂ تعلیم کے متعلق چند باتیں زیادہ قابلِ لحاظ ہیں،

(۱) یہ کہ قریبًا تمام کالجوں اور اسکولوں میں فرنچ زبان لازمی ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ تعلیم جدید کا معمولی تعلیم یافتہ بھی فرنچ زبان سے ناآشنا نہیں مل سکتا،

(۲) تمام بڑے بڑے کالجوں میں فزیکس، کیمسٹری، جیالوجی وغیرہ کی تعلیم لازمی ہے، اور ان علوم کی عملی مشق کرائی جاتی ہے، اس غرض سے ہر کالج میں کثرت سے ان فنون کے آلات مہیا رہتے ہیں،

(۳) تاریخ کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے، مکتب ملکیہ کا کورس میں نے دیکھا تھا، چھ ضخیم جلدوں میں ہے، جس میں علاوہ اور ملکوں کے یورپ کی مفصل تاریخ ہے، اس کے ساتھ بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے متعلق یورپ کے اکثر مصنفین نے نے جو غلطیاں کی ہیں، اُن سے بحث اور اس پر ردّو قدح ہوتی ہے،

(۴) بجز مکتب سلطانیہ کے جس میں عیسائی طالب علم کثرت سے ہیں، باقی اور تمام مدارس میں ہر قسم کے علوم و فنون ملکی زبان یعنی ترکی میں پڑھائے جاتے ہیں، تمام علوم جدیدہ کا ترکی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، اور وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے، اگرچہ یہ امر بحث طلب ہے کہ ترجمہ تعلیم کا عمدہ ذریعہ ہے یا نہیں، اور ہندوستان کے

بڑے بڑے نامور ارباب الرائے نے اس بحث میں نفی کا پہلو اختیار کیا ہے لیکن غالباً
وہ بحث ہندوستان کے ساتھ مخصوص ہے، جہاں کی ملکی زبان گورنمنٹ کی زبان
نہیں ہے، ترکی زبان سلطنت کی زبان ہے، اور اس کی مثال تمام دنیا میں نہیں
مل سکتی کہ کسی سلطنت نے غیر قوم کی زبان میں علوم و فنون حاصل کر کے ترقی کی ہو،
انگلستان کی نشو و نما اس وقت شروع ہوئی جب علوم و فنون لیٹن سے انگریزی زبان
میں منتقل ہو کر آئے، اور کچھ شبہہ نہیں کہ ترکی کی ترقی بھی اگر ہو سکتی ہے، تو ملکی ہی
زبان کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے،

بورڈنگ کا طریقہ،

(۵) تعلیم و تربیت کے معاملہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور قابلِ عزت ہے
وہ بورڈنگ سسٹم ہے، حقیقت یہ ہے کہ ترکی نہایت فخر سے اس بات کا دعویٰ
کر سکتی ہے کہ اس نے بورڈنگ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس سے بہتر نہیں ہو سکتا،
تمام بڑے بڑے کالجوں کے ساتھ بورڈنگ ہیں، اور ان میں نہایت کثرت سے طلبہ
رہتے ہیں، لیکن یہ التزام ہے کہ خوراک، لباس، وضع، مکان، فرنیچر تمام چیزیں ایک
سی ہوں، اور طالب علموں کی حالتوں میں فرقِ مراتب کا کوئی شائبہ نہ ہو، بورڈنگ
کا کرایہ اور خوراک کی جو فیس لی جاتی ہے، اس کے ساتھ کپڑوں کے دام بھی لئے
جاتے ہیں، اور طالب علموں کے کپڑے خود کالج کے اہتمام سے طیار ہوتے ہیں،
تمام لڑکے میز اور کرسیوں پر کھاتے ہیں اور ہر چیز میں تکلف، صفائی، خوش سلیقگی
کا نہایت اہتمام کیا جاتا ہے، فیس کی تعداد کسی کالج میں ۵ پونڈ سالانہ سے کم
نہیں ہے، اور مکتب سلطانیہ میں ۴۰ پونڈ یعنی چھ سو روپیہ سالانہ ہے،
ترکوں کی یہ عجیب قابل قدر فیاضی ہے کہ باوجود زیادتی فیس کے غربا ان

کالجوں کے فیض سے محروم نہیں ہیں، ہر کالج میں غریب طالب علموں کی معتد بہ تعداد ہے، اور دولت مند ترکوں کی طرف سے ان کو اس قدر امداد دی جاتی ہے، کہ وہ کالج کے تمام مصارف ادا کر سکتے ہیں، مکتب سلطانی جس کی فیس چالیس ۴۰ پونڈ سالانہ ہے، اس میں ۲۰۰ طالب علم غریب اور کم مقدور ہیں، ان میں سے ڈیڑھ سو ۱۵۰ طالب علموں کی فیس امرا، اور اراکین حکومت ادا کرتے ہیں، اور پچاس کی سلطان اپنی جیب خاص سے عطا فرماتے ہیں، اس کا یہ اثر ہے کہ کالج کے احاطہ میں جاکر کوئی شخص کسی طرح تمیز نہیں کر سکتا، کہ فلاں طالب علم غریب اور کم مقدور ہے، طالبعلموں کی یکساں حالت، اُن میں اتحاد اور قومیت کا نہایت قوی خیال پیدا کرتی ہے، اور غربا کو اعلیٰ درجہ کی معاشرت کا حاصل ہونا ان میں حوصلہ مندی اور بلند نظری کا مادہ پیدا کرتا ہے، یورپ کے بڑے بڑے کالجوں میں یہ بڑی کمی ہے، کہ کم مقدور لوگوں کو انکی فیاضی سے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا، ترکوں نے اسی نقصان کا تدارک کیا ہے، اور نہایت خوبی سے کیا،

بورڈنگ کا یہ طریقہ: دیکھکر مجھ کو اپنا مدرستہ العلوم یاد آتا تھا، اور میں اس کے بورڈنگ کے اختلافِ مراتب پر افسوس کرتا تھا، لیکن میرا افسوس درحقیقت مدرستہ العلوم کی حالت پر نہ تھا، بلکہ قوم کے اُن بزرگوں پر تھا، جن کو خدا نے دولت اور مقدور دیا ہے، لیکن یہ توفیق نہیں دی کہ اپنی فیاضی سے اس بات کی کوشش کریں، کہ ہماری تعلیم گاہ میں غربا اور اہلِ مقدرت ایک ہی بلند سطح پر نظر آئیں، میں علانیہ کہتا ہوں کہ ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری اور نہایت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر،

کلیتہً ایک کر دیا جائے، اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹا دی جائیں

اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں،

طالبعلموں کا لباس،

یہاں کالجوں اور اسکولوں میں ایک اور جدت ہے، اور نہایت مفید اور موثر ہے، وہ یہ کہ ہر طالب علم کے کوٹ کے گریبان پر سنہری کلابتوں میں اس کالج یا اسکول کا نام کڑھا ہوا ہوتا ہے، جس میں وہ تعلیم پاتا ہے، کلابتوں کے صرف اُبھرے ہوئے اعلیٰ درجہ کے خط نسخ کے مطابق ہوتے ہیں، چار بجے کے قریب کالجوں اور اسکولوں کی گذرگاہوں پر جاؤ تو عجیب دلفریب سیر نظر آتی ہے، غول کے غول لڑکے مدرسوں سے نکل کر متعدد صفوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، اور اس ترتیب و انتظام سے چلتے ہیں کہ گویا باقاعدہ فوج جا رہی ہے، لڑکوں کا سرخ و سپید رنگ، اس پر سیاہ کوٹ اور کوٹوں کے گریبان پر کالجوں کا زرّیں طغرا اس قدر خوش نما معلوم ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے،

اِس طریقہ سے علاوہ زیب و زینت اور شان و شوکت کے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم سیر و تماشے کی غرض سے بازار میں نکلتے ہیں، تو کوئی نامناسب حرکت نہیں کر سکتے، کالج کا لباس جس کا ہر وقت پہننا لازمی ہے، پہچنوا دیتا ہے کہ وہ طالب العلم ہیں، اس لئے خواہ مخواہ ان کو کالج کے ناموس کا لحاظ کرنا پڑتا ہے، اس پر بھی اگر کوئی لڑکا کسی ناروا صحبت میں شریک یا کسی بیہودگی کا مرتکب ہو تو پولس مین پکڑ کر اس کو اُس کالج یا اسکول میں پہنچا آئے گا جہاں وہ تعلیم پاتا ہے،

یہاں کے بورڈنگ سسٹم میں بظاہر ایک نقصان معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ الگ

الگ کمرے نہیں ہوتے، بلکہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لڑکوں کے لئے، ایک بڑا ہال ہوتا ہے، جس میں ان کی تعداد کے موافق پلنگ بچھے ہوتے ہیں، ہر پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹی سی الماری ہوتی ہے، جس میں معمولی کپڑے اور کتابیں آجاتی ہیں، میں نے اول اول یہاں کے بورڈنگ دیکھے تو فی الجملہ ان کی حقارت کا خیال پیدا ہوا، خصوصاً اس وجہ سے کہ مدرستہ العلوم کے پُرتکلف اور آراستہ کمرے میری آنکھوں کے سامنے تھے، لیکن زیادہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ طریقہ فائدہ سے خالی نہیں، اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ اس کمی کی اصلی وجہ کثرتِ آبادی اور کافی زمین کا نہ میسر آنا ہے، لیکن اُن فوائد کے لحاظ سے جو بغیر اس خاص طریقہ کے حاصل نہیں ہو سکتے، اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ قصداً ایسا کیا گیا ہے، اور ایسا ہی مناسب تھا تو کچھ بیجا نہ ہوگا،

اس طریقہ سے جو نہایت مفید کام لیا گیا ہی، وہ یہ ہے، کہ تمام بورڈروں کی روزانہ زندگی یکساں اُصول پر قائم کی گئی ہی، مثلاً صبح ہوئی اور چوکیداروں نے جو تمام رات سونے کے کمرے میں ٹہلا کرتے ہیں تمام بورڈروں کو جگا دیا، دیواریں لڑکوں کی تعداد کے موافق ٹونٹیاں لگی ہیں، اور اُن کے نیچے پکی نالی بنی ہے تمام لڑکے وہاں جاکر ایک ساتھ بیٹھ گئے، لڑکوں کے ایک ساتھ آجانے کا اس قدر التزام ہے کہ بعض بعض کالجوں میں ایک کل ہے جس کے پھرانے سے تمام ٹونٹیوں کا منہ ایک ساتھ کھل جاتا ہے، جب تمام لڑکے آجاتے ہیں تو نوکر اس کل کو پھراتا ہے، اور وقتِ مقررہ کے گذرنے پر بند کر دیتا ہے، اگر کوئی لڑکا دیر کرکے آئے تو اُس کو واپس جانا ہوگا، کیونکہ صرف ایک شخص کے لئے

بہت سا پانی رائگاں نہیں کیا جا سکتا، ہاتھ منہ دھو کر تمام لڑکے ریڈنگ روم میں (جو کتب بینی کے لئے مخصوص ہے، اور جہاں ایک نگراں معلّم موجود رہتا ہے) جا کر بنچوں پر بیٹھ گئے، اور سبق کے یاد کرنے یا مطالعہ کے دیکھنے میں مصروف ہوئے، تمام طالب علم ایک ساتھ اٹھ کر کھانے کے کمرے میں گئے، کھانے کے بعد کالج کی گھنٹی ہوئی، اور سب کالج کے کمروں میں جا بیٹھے، رات کو بھی تمام طالب علم ایک ہی کمرے (ریڈنگ روم) میں پڑھتے ہیں اور جب سونے کا وقت آتا ہے، تو سب ساتھ اٹھ کر سونے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں، غرض سو کر اُٹھنا، ہاتھ منہ دھونا، سبق مطالعہ کرنا، کھانا کھانا، کھیلنا، نماز کا پڑھنا، اور رات کے دس بجے اپنے اپنے پلنگ پر جا کر پڑ رہنا، یہ سارے کام طالب العلموں کو ایک ساتھ کرنا پڑتے ہیں، اس طریقہ سے حفظِ اوقات کی عادت ہو جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ وہ طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اس طریقہ کے لئے ضرور ہے، کہ ایک ایک کمرے میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ طالب علم کے رہنے کا انتظام کیا جائے ورنہ الگ الگ کمروں میں تمام کاموں کے ایک ساتھ انجام پانے کا کسی طرح انتظام نہیں ہو سکتا، ہمارے کالج میں ظہور حسین وارڈ جو ابھی قائم ہوا ہے، اسی اصول پر قائم ہوا ہے،

ترقی تعلیم میں ابھی تک بعض باتوں کی کمی ہے،

تعلیم کی وسعت اور ترقی کے متعلق اگرچہ یہ سب کچھ اہتمام ہے تاہم چونکہ نئے طریقہ تعلیم نے حال میں رواج پایا ہے، اس لئے ابھی بہت سی باتوں کی کمی ہے، جس کی نسبت امید ہے کہ رفتہ رفتہ پوری ہو جائے گی، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کالج بلکہ تمام شہر میں کوئی ڈبیٹنگ کلب اور علمی انجمن نہیں ہے، اس لئے طالبعلموں کو تقریر کا ملکہ بہم پہونچانے کا کوئی موقع نہیں ملتا، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کالجوں

کے ڈگری یافتہ مجمعِ عام میں کسی مضمون پر لکچر یا اسپیچ نہیں دے سکتے، اسی کا یہ بھی اثر ہے، کہ تعلیم یافتہ گروہ میں ابھی تک وہ زندہ دلی، آزاد خیالی، حوصلہ مندی، بلند نظری نہیں پیدا ہوئی ہے، جو نئی تعلیم کا لازمہ ہے،

ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ کالجوں اور بڑے بڑے اسکولوں کا وجود دار الخلافت کی شہر پناہ تک محدود ہے، بڑے بڑے شہروں میں اگرچہ کثرت سے مدرسے قائم ہو گئے ہیں، لیکن وہ عموماً ابتدائیہ اور رشدیہ یعنی اوسط درجہ کے مدارس ہیں، جہاں تک میری واقفیت ہے، بیروت، دمشق، حلب، بیت المقدس میں ایک بھی ایسا علمی مدرسہ نہیں، جس پر کالج کا لفظ صادق آسکے،

اس سے بڑھکر یہ افسوس ہے کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج اور دار العلوم جن کا میں نے ذکر کیا، حکومت کی طرف سے ہیں، قوم نے ابھی تک اس طرف کچھ توجہ نہیں کی ہے، یعنی اتنے بڑے دار السلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں، کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولت مند ہو، لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہو سکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں، جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے اُس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بیکار ہو جاتی ہیں، یورپ میں جو عظیم الشان علمی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر قوم کا حصہ ہے، انگلستان کی مشہور یونیورسٹیاں، کیمبرج اور آکسفورڈ قومی ہی کوششوں سے قائم ہوئی ہیں، اور اس وقت تک اُنھوں نے گورنمنٹ کا زیر بار احسان ہونا منظور نہیں کیا ہے،

اس اجمالی رپورٹ کے بعد ہم بعض بعض کالجوں کا تفصیلی حال لکھتے ہیں،

یہ بہت بڑا کالج بلکہ بہت بڑی یونیورسٹی ہے، جس پر ترکوں کو فخر ہے، اور درحقیقت وہ اس فخر کا مستحق ہے، اگرچہ حربی تعلیم اصطلاحی تعلیم کے مفہوم سے کسی قدر الگ ہے، اس لحاظ سے، ترقیِ تعلیم کے ذیل میں مکتبِ حربیہ کا ذکر کرنا بظاہر موزوں نہ تھا، لیکن اس کالج میں حربی علوم کے علاوہ طبیعیات، کیمیا، ریاضی اور بالخصوص طب کی تمام شاخوں کی تعلیم اس حد تک ہوتی ہے کہ ہم اس کو اصطلاحی تعلیم کے دائرہ سے باہر نہیں کہہ سکتے، یہ کالج ۱۲۵۰ھ میں سلطان محمود نے قائم کیا تھا، اس زمانہ کی بہ نسبت عمارت میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے، اور نصابِ تعلیم تو اس قدر وسیع اور اعلیٰ ہوگیا ہے کہ گویا وہ کالج ہی نہیں رہا،

اس کالج کے ماتحت جس قدر حربی مدارس ہیں ان کی تعداد (۴۷) ہے، جنمیں (۱۸) اعدادیہ ہیں، (۲۷) رشدیہ جن میں کل ۹۲۲۴ طالب علم تعلیم پاتے ہیں، تفصیل نقشۂ ذیل سے معلوم ہوگی،

قسم مدرسہ	مدارس پایہ تخت		مدارس اضلاع	
	بورڈر	غیر بورڈر	بورڈر	غیر بورڈر
اعدادی	۱۰۹۶	۰	۷۴۵	۰
رشدیہ	۱۵۵	۲۴۲۵	۱۲۸	۲۲۲۵

یہ کالج (مکتب حربیہ) بڑی عظمت و شان کا کالج ہے، اگرچہ قسطنطنیہ میں

عام دستور ہے کہ سکریٹری مدرسہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی مدرسہ کے احاطہ میں داخل نہیں ہو سکتا، لیکن اس کالج میں اور بھی زیادہ اہتمام اور روک ٹوک ہے، میں نے جب اس کی سیر کا قصد کیا تو لوگوں نے کہا کہ اس کے لئے "ارادہ سنیہ" یعنی خود سلطان کی اجازت درکار ہے، اگرچہ ممکن تھا کہ عثمان پاشا جن سے اس زمانہ میں مجھ کو شرفِ ملازمت حاصل ہو چکا تھا، مجھ کو بآسانی اجازت دلاتے لیکن میں نے اس کام کے لئے ان کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا، حسین حسیب آفندی پولس کمشنر سے بے تکلفانہ ملاقات تھی، ان سے تذکرہ کیا بولے کہ "درحربیہ مأذون نیستم"، مجبوراً مجھ کو ذاتی کوشش پر بھروسہ کرنا پڑا، اتنا معلوم ہو چکا تھا کہ مکتب حربیہ کے سکریٹری ذکی پاشا ہیں، جو نہایت لائق اور اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہیں، میں نے خیال کیا کہ بغیر کسی واسطے کے خود ان سے ملنا چاہئے، شیخ علی ظبیان نے بھی یہی رائے دی، چنانچہ ہم دونوں پاشائے موصوف کے مکان پر گئے،

اتفاق سے وہ باہر جا چکے تھے، آدمی نے کہا ذرا ٹھہر جائیے، شاید جلد آجائیں، اسی اثنا میں وہ آپہونچے، گاڑی سے اُترنے کے ساتھ اُنھوں نے ہماری طرف رُخ کیا، شیخ علی ظبیان اور میں دونوں عربی لباس میں تھے، اگرچہ میرے سر پر ریشمی عمامہ اور کمر میں سنہری پیٹی تھی، لیکن قفطان اور عبا کی وجہ سے مجموعی صورت سے عرب معلوم ہوتا تھا، پاشائے موصوف کو اس وقت نہایت جلدی تھی، سلام علیک کے ساتھ ہی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ مجیدیاں (ترکی سکہ) نکالیں، پہلے تو مجھ کو سخت تعجب ہوا، پھر یہ خیال آیا کہ نعوذ باللہ انھوں نے ہم کو عام عربوں کی طرح گداگر سمجھا، اس خیال کے ساتھ مجھ کو نہایت رنج اور رنج کے ساتھ غصہ

آیا میں نے چلا کر کہا شو ھذا، ماجئنا لھذا۔ لسنا من الفقراء، یعنی یہ کیا ہے ؟ ہم اس لئے نہیں آئے، ہم محتاج نہیں ہیں، پاشائے موصوف اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے لیکن چہرے کی ہیئت اور لہجہ کلام سے سمجھے کہ یہ امر اس کو ناگوار گذرا، شیخ علی ظبیان کی طرف متوجہ ہوئے، کہ یہ غیظ میں کیوں ہیں؟ اور چاہتے کیا ہیں ؟ شیخ علی ظبیان ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتے تھے، میرے آنے کی غرض و غایت بیان کی، پاشائے موصوف نہایت شرمندہ ہوئے، معذرت کے ساتھ کہا کہ آپ بالاخانے پر چلئے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، بالاخانے پر چند معزز عہدہ دار جمع تھے، اُنھوں نے نہایت احترام کے ساتھ ہمارا استقبال کیا، معمول کے موافق قہوہ آیا، ایک ایک سے مزاج پرسی ہوئی، ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور تحقیقاتِ علمی کی غرض سے یہاں آیا ہوں تو اس قدر گرویدہ ہوئے کہ ہر لفظ اور ہر ادا سے شوق اور محبت کا اظہار ہوتا تھا، نہایت افسوس تھا کہ میں نہ ترکی سمجھتا تھا، نہ فرنچ، اور وہ ان زبانوں کے سوا اور کسی زبان میں گفتگو نہ کر سکتے تھے، اُٹھ اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھتے تھے اور اظہارِ محبت کے ساتھ افسوس ظاہر کرتے تھے کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے، تھوڑی دیر کے بعد ذکی پاشا نے معذرت کے ساتھ کہلا بھیجا کہ مجھ کو ضروری کام درپیش ہے، اس لئے میں خود نہیں آ سکتا، لیکن میں نے ایک افسر کو حکم دے دیا ہے، وہ آپ کو اچھی طرح کالج کی سیر کرا دے گا، ان صاحب کا نام رضا بک تھا، اور میر آلائی کا رتبہ رکھتے تھے، پاشائے موصوف کی معذرت اگرچہ بہانہ پر محمول نہیں ہو سکتی تھی، واقعی ان کو بہت سے محکمے سپرد ہیں، اور تمام تمام دن ان کو

دورے میں گذر جاتا ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ ان کو اپنی حرکت پر سخت ندامت ہوئی تھی اور یہ بھی اُن کے نہ آنے کا ایک سبب تھا،

مجھ کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہاں علمار اور متصوّفین جب کسی امیر یا عہدہ دار سے ملتے ہیں تو اسی غرض سے ملتے ہیں کہ ابیضِ نورانی ہاتھ آئے، ذکی پاشا کی بدگمانی کا رنج تو جاتا رہا، لیکن اس فرقہ کے حال پر بہت افسوس ہوا، نذر و نیاز کے طریقہ کو میں ہندوستان کے ساتھ مخصوص سمجھتا تھا، لیکن افسوس یہاں بھی اس سے نجات نہیں پائی،

قصّہ مختصر رضا بک کے ساتھ ہم مکتب حربیہ کو گئے، دروازے پر پہرہ تھا، سپاہیوں نے فوجی قاعدے سے سلام کیا، اندر داخل ہوئے تو کالج کیا ایک مستقل آبادی تھی، رضا بک پہلے اپنے خاص کمرے میں لے گئے، وہاں کے اور چند عہدہ دار موجود تھے، اُن سے تعارف ہوا، معمول کے موافق قہوہ آیا، تھوڑی دیر کے بعد رضا بک نے کہا کہ کھانے کی گھنٹی ہو چکی ہے، آئیے، سب سے پہلے آپ کو کھانے کے کمرے کی سیر کرائیں، چونکہ اس وقت ڈائننگ روم (کھانے کا کمرہ) اور اس کے متعلق جو عمارتیں ہیں ڈھا کر نئے سر سے تعمیر ہو رہی تھیں، اس لئے کالج کے سلسلۂ عمارت سے کسی قدر فاصلہ پر ایک مکان عارضی طور پر بنایا گیا تھا، اور کالج سے اس عمارت تک صاف اور ہموار سڑک تیار کی گئی تھی، لڑکے اپنے اپنے کمروں سے نکل کر ڈائننگ ہال چلے تو عجیب دلفریب سماں نظر آیا، پانچ پانچ چھ چھ لڑکوں کی تیس چالیس صفیں تھیں اور اس ترتیب و انتظام کے ساتھ جا رہی تھیں، کہ گویا باقاعدہ

فوج مارچ کر رہی ہے، وضع اور لباس بالکل ایک سا تھا اور چونکہ تمام لڑکے
ترک یا شامی عرب تھے، رنگ و روپ میں بھی چنداں فرق نہ تھا، تعجب یہ
ہے کہ اس گروہ کے ساتھ نہ کوئی افسر تھا نہ ان کو ہمارا آنا معلوم تھا، تاہم ان کی
کوئی حرکت ترتیب و انتظام کے خلاف نہ تھی اور شور و غل کا مطلق نام نہ تھا،
جب ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو تمام لڑکے میز پر بیٹھ چکے تھے، ہال نہایت
وسیع اور خوبصورت اور چھت پر طلائی کام تھا، دو تین قسم کے کھانے تھے،
اور ترکی طریقہ کے موافق چار چار لڑکوں کے بیچ میں ایک ایک قاب تھی چھری
کانٹے نہ تھے، صرف چمچے تھے، لیکن لڑکے کھاتے اس خوش سلیقگی سے تھے کہ
نہ کسی کا ہاتھ بھرتا تھا، نہ میز کی چادر پر کہیں دھبہ پڑ سکتا تھا، غالباً لڑکوں پر
صفائی و پاکیزگی کی سخت تاکید ہے، چار پانچ سو لڑکے جو ہال میں موجود تھے
یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی کپڑے بدل کر آئے ہیں، ہم جدھر گذرتے بعض بعض لڑکے
کھڑے ہو جاتے اور کہتے تفضل یا مولانا، ان کے اصرار سے ہم نے دو ایک
لقمے کھائے کھانا برا نہ تھا، لیکن ہم ہندوستانی قورمہ ڈھونڈھتے تھے، وہ
یہاں کہاں؟

کھانے کے کمرے سے نکل کر تھوڑی دیر تک ہم ادھر اُدھر پھرتے رہے
یہاں تک کہ کالج کی گھنٹی ہوئی اور لڑکے لکچرز روم کو چلے،

لکچرز روم (تعلیم کے کمرے) ہمارے ہندوستان کی قطع کے
نہیں ہیں دور تک سیدھی قطار میں بہت سے کمرے ہیں، جن کی قطع عام
مکانات کی سی ہے، پروفیسر ایک بلند چبوترہ پر بیٹھتا ہے، بعض بعض چبوترہ دو

کھانے میں لڑکوں کی صفائی اور خوش...

لکچرز روم

کے گرد لکڑی کا کٹہرہ بھی تھا، رضا بک اور ان کے ساتھ ہم جس کمرے میں جاتے ایک لڑکا اُٹھ کر "بق" کا لفظ بلند آواز سے کہتا، اس آواز کے ساتھ تمام لڑکے کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے معلوم ہوا کہ کالج کا جب کوئی افسر آتا ہے، تو لڑکے اسی طرح اُس کی تعظیم بجا لاتے ہیں، رضا بک ہم کو تمام پروفیسروں سے انٹرڈوس کراتے تھے، لیکن افسوس یہ تھا کہ ہم کسی کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے

حمام، چھاپہ خانہ، نقاش خانہ، اور اس قسم کی بہت سی عمارتیں جو کالج کے احاطہ میں ہیں، ہم نے سب کی سیر کی، یہ عمارتیں اس کثرت سے ہیں کہ قریباً دو گھنٹے تک ہم برابر پھرے تب کہیں جا کر ختم ہوئیں، تشریح کی تعلیم کا کمرہ نہایت وسیع ہے، اور اعمالِ تشریحی کے سامان کثرت سے جمع ہیں، نقشہ کشی اور مصوری کے جو نمونے میں نے یہاں دیکھے کبھی نہیں دیکھے تھے، چھاپہ خانہ میں ایک ایجاد یہ دیکھی کہ جغرافیہ کا نقشہ بجائے کاغذ کے پتھر پر بنا کر چھاپا جاتا تھا، جو نقشہ اس وقت تیار ہو رہا تھا، نہایت گنجان اور باریک تھا، اور درحقیقت بڑی دیدہ ریزی کا کام تھا،

طالب علموں کی تفریح کے لئے ایک خوبصورت حوض بنا ہے، جس میں مختلف رنگ کی مچھلیاں پڑی ہیں، اور جا بجا بنچیں اور کرسیاں بچھی ہیں، پروفیسروں اور ٹیچروں کے لئے ذرا فاصلے پر الگ حوض ہے، چونکہ چلتے چلتے تھک گئے تھے، ہم نے وہاں دم لیا اور دیر تک صحبت رہی، رجب آفندی جو ترکی زبان کی انشا سکھانے پر مامور ہیں، اور فارسی زبان جانتے ہیں، آخری دورے میں ہمارے ساتھ ہو لئے تھے، ان کے ذریعہ سے کالج کے معزز افسروں سے

بے تکلف بات چیت ہو سکتی تھی، پروفیسروں اور طالب علموں نے مجھ سے جس خوش خلاقی اور اسلامی محبت کا برتاؤ کیا میں اس کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا، اس بات کا نہایت افسوس رہا کہ جس دن ہم نے کالج کو دیکھا وہ عملی تعلیم کا دن نہ تھا، اس وجہ سے فوجی مشقیں یعنی قواعد، نشانہ بازی، شہسواری، مورچہ بنانا، دمدمے تیار کرنے اور اس قسم کی کوئی چیز نہ دیکھ سکے، ممکن تھا، کہ اور کسی دن جا کر دیکھتے لیکن ہماری قیام گاہ سے کالج اس قدر دور تھا، کہ پھر ہمت نہ ہوئی، اس کالج میں تعلیم کی متعدد شاخیں ہیں،

تعلیم کی متعدد شاخیں،

ارکان حربیہ،

(۱) ارکان حربیہ یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اور اس کی مدت تعلیم تین برس ہے، اس کی دو شاخیں ہیں، فنی و عسکری، فنی میں مضامین ذیل پڑھائے جاتے ہیں تقسیم اراضی و ہیئت، نظریات جر ثقیل، معماری، زبانہائے فرنچ و جرمن و روس، قلعوں کا محاصرہ اور اس کے اصول جنگ، فوجی ٹیلگراف، وظائف ارکان حرب، فوجی ایجادیں، عملیات، اشکال معماری، سفر مینا، ممالک عثمانیہ کی سرکیں اور کل ممالک یورپ کی ریلوے لائنیں، فن اسلحۂ ثقیلہ، علم طبقات الارض، یورپ کی فوجوں کی ترتیب اور اصول، دنیا کی مشہور لڑائیاں، اور فوجی اصول کے لحاظ سے ان کی کیفیت وقوع اور فتح و شکست کے اسباب کی تحقیق، اقلیدس، جبر و مقابلہ، جغرافیا، فن اسلحہ خفیفہ، کتابت، تاریخ فن حرب، تصویر کشی،

عسکری میں بھی اکثر یہی مضامین ہیں، اس کے ساتھ بعض بعض جدید مضامین ان دونوں درجوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر کی ابتدائی تعلیم رشدیہ اور اعدادیہ میں ہو چکتی ہے، ان درجوں میں صرف ان کی تکمیل ہوتی ہے،

اور یہی وجہ ہے کہ تین برس میں اس قدر مختلف مضامین کی تحصیل ہو سکتی ہے، رشدیہ سے اس درجہ تک کی تعلیم کی کل مدت دس برس ہے،

(۲) سواری کی تعلیم، اس کی مدت تعلیم تین برس ہے، اور علاوہ عملی مشقوں کے مضامینِ ذیل کی تعلیم ہوتی ہے، ہندسہ رسمیہ، پلوغرافیا نظری و عملی زبانہائے فرنچ و جرمن و روس، کیمیا فن اسلحہ، فوجی ایجادات جغرافیائے عسکری،

(۳) پیادہ، مدتِ تعلیم تین برس، اس میں علاوہ مشقوں کے جغرافیہ فوجی، فن اسلحہ، جرمن و فرنچ و روسی زبانیں، فوجی ایجادات، استحکاماتِ خفیفہ حفظ الصحت کی تعلیم ہوتی ہے،

(۴) بیطر یعنی طب حیوانات، مدتِ تعلیم چار برس، مضامینِ درسیہ یہ ہیں، عام امراض، فن ولادت، فن فروسیت، امراضِ داخلیہ، امراضِ متولیہ، فن جراحی، امراضِ خارجیہ، فرنچ زبان، کتابت، کیمیائے عضوی، مفرداتِ طب، تشریح، منافع الاعضا، نباتات، علم الحیوانات، کیمیات غیر عضوی، علم الارض والمعاون، ان چاروں صیغوں میں قریبًا چھ سو لڑکے زیرِ تعلیم ہیں، اور ان کو سند حاصل کرنے کے بعد حسبِ مراتب، افسری کے عہدے ملتے ہیں، ان کے نیچے اعدادیہ اور رشدیہ کی کلاسیں ہیں، جن کی مدتِ تعلیم سات برس ہے، اور تاریخ، جغرافیہ، حساب، اقلیدس، طبعیات، کلون کا کام اور اس قسم کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، کل طالبِ علم جو اس کالج کی مختلف شاخوں میں تعلیم پاتے ہیں، تعداد میں پندرہ سو ہیں، جن میں سے ایک ہزار بورڈر ہیں، پروفیسر، اسسٹنٹ پروفیسر و ٹیچر ۷۰ ہیں جن میں سے اکثر کالج ہی کے احاطہ میں سکونت رکھتے ہیں، اکثر پروفیسر

اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اور معزز عہدہ دار ہیں، ان میں سے چھ شخص پاشا کا منصب رکھتے ہیں، جن کے نام یہ ہیں، ثروت پاشا سکریٹری، فائق پاشا پروفیسر کیمیائے عضوی، ہزبر پاشا پروفیسر تعلیم سواری، تفوق پاشا پروفیسر طبقات الارض، شاکر پاشا پروفیسر ارکان حرب، عثمان پاشا پروفیسر زبانِ جرمن، نو پروفیسروں کو میر آلائی کا رتبہ حاصل ہے،

مکتبِ سُلطانی

یہ بھی قدیم کالج ہے، اور مکتبِ حربیہ کے سوا تمام کالجوں سے ممتاز ہے، یہ غلطہ سرائے میں واقع ہے، جہاں زیادہ تر یورپین تاجر آباد ہیں، اور اس وجہ سے تمام اور کالجوں کی بہ نسبت عیسائی لڑکے اس میں زیادہ ہیں.

مجھ کو افسوس ہے کہ جس وقت میں نے کالج کو دیکھا تعطیل کا زمانہ تھا، اور بجز دو تین عہدہ داروں یعنی سکریٹری اور نائب سکریٹری وغیرہ کے اور کوئی افسر موجود نہ تھا، کالج کی عمارت دو منزلہ ہے. بورڈنگ اور لکچر روم سب اوپر کے درجے میں ہیں علم الحیوانات کی تعلیم کے لئے نہایت وسیع کمرہ ہے جس میں کثرت سے ہر قسم کے مردہ جانور اور بڑے بڑے جانوروں کے ڈھانچے ہیں، وھیل مچھلی کا ڈھانچہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا، کیمیا اور الکٹرسٹی کے تجربوں کے لئے کثرت سے بیش قیمت آلات مہیا کئے گئے ہیں،

یہ بات مجھ کو بہت پسند آئی کہ بیمار بورڈروں کے لئے ایک نہایت وسیع ہال آراستہ ہے، جس میں کثرت سے پلنگ وغیرہ موجود ہیں، اور متعدد خدمتگار

ہر وقت حاضر رہتے ہیں، اس طریقہ سے ڈاکٹر کو لڑکوں کے علاج اور تیمارداری میں آسانی ہوتی ہے، وہ ایک ہی وقت میں تمام بیماروں کو دیکھ سکتا ہے، ورنہ الگ الگ کمرے ہوں تو ایک ایک بیمار کے پاس پہنچنا اور کافی طور سے ان کی پرداخت اور خبرگیری کرنی سخت مشکل ہو،

اس کالج کا صرف ۱۸ ہزار پونڈ یعنی دو لاکھ ستر ہزار روپیہ سالانہ ہے، لیکن اس میں غریب طالب علموں کی اسکالرشپ کی رقم بھی شامل ہے، طالب علموں کی مجموعی تعداد آٹھ سو ہے، جن میں زیادہ تر بورڈر ہیں، بورڈروں کی خوابگاہ کا کمرہ نہایت وسیع، شاندار اور خوش فضا ہے، بورڈنگ کا جو دستور العمل ہے اس کے چند دفعات کا خلاصہ ذیل میں درج ہے،

(۱) تمام بورڈروں کی خوراک، کپڑے، بچھونے، کتاب، کاغذ، قلم وغیرہ کالج کی طرف سے مہیا کیا جائیگا،

(۲) بورڈر سے ۴۰ پونڈ سالانہ (چھ سو روپیہ) فیس لی جائیگی،

(۳) ایسے طالب علم بھی داخل ہو سکتے ہیں جو دو ثلث یا ایک ثلث فیس ادا کر سکتے ہیں یا بالکل نہیں ادا کر سکتے، لیکن ان کی تعداد معین ہو گی، جو ہر سال کے شروع میں ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے محکمہ سے استفسار کر کے قرار دیجائے گی (یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے طلبہ کی بقیہ فیس سلطان اور امرائے شہر ادا کرتے ہیں، اور اس وجہ سے خوراک، لباس، فرنیچر وغیرہ کے لحاظ سے ان میں اور ذی مقدور طالب علموں میں کسی قسم کا فرق محسوس نہیں ہو سکتا)

(۴) داخلے کے وقت ہر طالب علم سے کپڑوں کی بابت ۵ پونڈ یعنی دو سو پچیس روپئے لئے جائیں گے،

(۵) وہ طالب علم جو رات کو بورڈنگ میں نہیں رہتے، ان کی فیس ۲۰ پونڈ سالانہ ہے اور کسی حالت میں وہ گھٹ نہیں سکتی،

(۶) غیر بورڈروں کی فیس ۱۰ پونڈ سالانہ ہے، اور کسی حالت میں وہ کم نہیں ہو سکتی،

(۷) بورڈروں کو ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ اپنے گھر جانے کی اجازت ملیگی، جانے اور آنے کے وقت ایک معتبر ملازم کا ان کے ساتھ ہونا ضرور ہے،

(۸) کوئی بورڈر ایک ہفتہ میں دس قرش (سوا روپیہ) سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، تعلیمی حیثیت سے اس کالج میں جو خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ تمام علوم و فنون فرنچ زبان میں پڑھائے جاتے ہیں، اور اس وجہ سے اکثر پروفیسر فرنچ یا جرمن ہیں، اس کے ساتھ ترکی زبان کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے، عربی و فارسی کی تعلیم بھی لازمی ہے گو اعلیٰ درجہ کی نہیں باقی زبانیں، یونانی، ارمنی، انگریزی، جرمن، اٹالین، لیٹن، درس میں داخل ہیں، اور بہت سے لڑکے پڑھتے بھی ہیں، لیکن ان کی تعلیم اختیاری ہے، لازمی نہیں،

ترکی و عربی و فارسی میں علاوہ علم ادب اور قرآن مجید کے جن مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، وہ یہ ہیں، عقائد، فقہ، اخلاق، تاریخ، دولت عثمانیہ، قرات و تجوید، حدیث و تفسیر، لیکن قرات و حدیث و تفسیر کی تعلیم چوتھے برس سے شروع ہوتی ہے، اور ہفتہ میں صرف ایک بار ہوتی ہے، فرنچ زبان شروع ہی سے پڑھائی

جاتی ہے، اور اختتامِ تعلیم یعنی سات برس تک برابر جاری رہتی ہے، نحو، صرف، ادب کے ساتھ اصول انشاءنگاری و فن بلاغت اعلیٰ درجہ تک پڑھایا جاتا ہے، اور مضامینِ ذیل کی تعلیم بھی اسی زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے، حساب، جبرو مقابلہ جغرافیہ، ہندسہ، کیمسٹری، علم الحیوانات، طبعیات، علم النبات الکٹرسٹی، علم الاصوات، علم طبقات الارض، رسم ہندسی، رسم تقلیدی،

پروفیسروں اور ٹیچروں کی مجموعی تعداد ۴۷ ہے، جن میں ۲۶ جرمن اور فرنچ اور باقی ترک ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ وسعتِ عمارت، فراہمی آلات علمی، وسعت تعلیم، اور خوبی انتظام کے لحاظ سے تمام قسطنطنیہ میں اس سے عمدہ تر کوئی کالج نہیں ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ اس کی اعلیٰ کلاسوں میں تعلیم پانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں، مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، یشخ عبدالفتاح آفندی نے مجھ کو سال رواں کی رپورٹ نتیجۂ امتحان عنایت کی تھی، اس میں جس قدر اعلیٰ درجہ کے امتحانات پاس کرنے والے ہیں، اکثر عیسائی ہیں، مجھ کو خدانخواستہ عیسائیوں کی ترقی پر حسد نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے تنزل کا رنج ضرور ہے،

مکتب ملکیہ

یہ کالج جو یہاں کا سول سروس کالج ہے، خاص سلطان کا قائم کردہ ہے اور حضرت ممدوح کو اس کی طرف التفاتِ خاص ہے، چنانچہ دوبار بنفس نفیس

اس کے ملاحظہ کو تشریف لاچکے ہیں،

پہلے اس میں پانچ درجے تھے، تین ادنیٰ اور دو اعلیٰ، اس لحاظ سے کل مدتِ تعلیم پانچ برس تھی، لیکن تعلیم کے ہائی اسٹینڈرڈ کے قائم کرنے کے لئے دو درجے اور بڑھا دیئے گئے ہیں، اور کل مدتِ تعلیم سات برس قرار دی گئی ہے، اس کالج میں فرنچ کے ساتھ یونانی اور ارمنی زبان کی تعلیم بھی لازمی ہے، عربی و فارسی بھی نصابِ تعلیم میں داخل ہے، لیکن لازمی نہیں، مضامین جن کی تعلیم ہوتی ہے، یہ ہیں، تاریخ، جغرافیہ، الکٹرسٹی وغیرہ، طبعیات، پولیٹکل اکانومی، اصول قانون، یورپ کے قوانین، ان تمام مضامین کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے، تاریخ کا کورس میں نے خود دیکھا، چھ ضخیم جلدوں میں تھا، اس کالج کے تعلیم یافتہ بڑے بڑے اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے جاتے ہیں، چنانچہ دوسو سے زیادہ اس وقت تک ملکی عہدوں پر مقرر ہوچکے ہیں، جن میں سے بعض بعض نہایت بلند رتبہ کے عہدہ دار ہیں، طلبہ جو اس وقت کالج میں تعلیم پارہے ہیں، ان کی تعداد ۶۰۰ سے زیادہ ہے،

طالبعلموں کی تعداد

میں نے اس کالج کی اچھی طرح سیر کی، کالج کے مینجر جو ایک معزز ترک ہیں اگرچہ عربی نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ ترجمان میرے ساتھ تھا، بے تکلف گفتگو ہوسکتی تھی، یہاں کے کالجوں میں میں نے یہ بات عموماً دیکھی، اور مجھ کو بہت پسند آئی، کہ مینجر معزز رتبہ کا آدمی ہوتا ہے، اور اس کی طرزِ معاشرت سے عزت و شان ظاہر ہوتی ہے، ان مینجر صاحب کا کمرہ بھی حسب معمول مرتب اور آراستہ تھا، میں جس وقت کالج میں پہونچا چھٹی کا گھنٹہ تھا، اور لڑکے

کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے، تھوڑی دیر کے بعد جب لڑکے کلاسوں میں آگئے
تو منیجر صاحب نے مجھ کو کالج کے تمام کمروں کی سیر کرائی، کھانے کا کمرہ نہایت
خوش سلیقگی سے مرتب تھا، میز پر نہایت صاف چادر بچھی تھی اور کھانے کے پرتکلف
برتن خوبصورتی کے ساتھ چنے تھے، صراحیاں جو طالب علموں کی تعداد کے موافق
تھیں، عموماً شیشے کی تھیں، اور گویا میز کی آرایش کا کام دیتی تھیں، کیمسٹری
وغیرہ کی تعلیم کے کمرے میں اعلیٰ درجہ کے آلات تھے، اور کثرت سے تھے اسی
سلسلۂ عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے، اسکی عمارت چنداں قابلِ ذکر نہیں
لیکن چونکہ اندر باہر نہایت اعلیٰ درجہ کا ترکی قالین بچھا ہوا تھا، خوبصورت
اور مزین معلوم ہوتی تھی، ایک طرف دیوار پر خط نسخ کا ایک عمدہ قطعہ آویزاں
تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ **سلطان عبد العزیز خاں** مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا
ہے، نہایت عمدہ خط ہے،

اسی اثنار میں ظہر کا وقت آگیا، مسلمان لڑکوں نے (عیسائی طالب علم بھی
یہاں کچھ کم نہیں ہیں) نماز کی تیاری کی، وہ عموماً کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھے،
اور اس لباس میں ان کا ادب اور متانت کے ساتھ وضو کرنا اور وقار و احترام
کے ساتھ قطار در قطار مسجد کو جانا میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا، حقیقت
یہ ہے کہ مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزل
ہزار درجہ بہتر ہے، نماز کے بعد تھوڑی دیر تک وعظ بھی ہوتا رہا، لیکن
بہت کم اس میں شریک تھے،

قدیم تعلیم اور مدارس قدیمہ

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ترکوں میں تعلیم کا آغاز سلطنت کے ساتھ ساتھ ہوا، یہ وہی تعلیم تھی جس کو ہم آج قدیم تعلیم کے نام سے یاد کرتے ہیں، بے شبہہ وہ کسی زمانہ میں اعلیٰ درجہ پر تھی، چنانچہ افضل الدین خونجی، علامہ قوشجی، چلپی، خواجہ زادہ، حاجی خلیفہ وغیرہ کی تصنیفات آج تک اس کی یادگار ہیں، لیکن موجودہ تعلیم پستی کی اس حد تک پہونچ گئی ہے، کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا، وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے، اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج و افسوس کیا جاتا ہے، لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ، پُرانی تعلیم پر جو رنج اور افسوس ظاہر کرتے ہیں، وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے، میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں، اور دل سے پسند کرتا ہوں، تاہم پُرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پُرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے، اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے، وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے، تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے،

ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے، لیکن قسطنطنیہ، شام، مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا ہے،

قصہ مختصر قدیم تعلیم کا یہاں کثرت سے رواج ہے، اور چونکہ اس قسم کے طالب علم اپنی وضع و لباس سے صاف پہچانے جاتے ہیں، اسلئے مسجدوں اور عام گذرگاہوں میں آسانی سے ان کی کثرت کا اندازہ ہو سکتا ہے، بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ خاص قسطنطنیہ میں ان کی تعداد بیس ہزار سے کم نہیں ہے، ان کی بسر اوقات کا جو طریقہ ہے وہ نہ صرف افسوسناک بلکہ حیرت انگیز ہے، یہاں کے تمام مدارس (قدیمہ) میں تین مہینے کی متصل تعطیل ہوتی ہے، جس کا آغاز رمضان المبارک سے ہوتا ہے، ان مہینوں میں تمام طلبہ قسطنطنیہ سے باہر چلے جاتے ہیں، اور دیہات اور قصبات میں پھر کر زکوٰۃ تحصیل کرتے ہیں، یہ زکوٰۃ ان کی سال بھر کی معاش ہے، بعض بعض مدرسوں میں اور وہ خال خال ہیں، کچھ روٹیاں بھی مقرر ہیں، لیکن کپڑے وغیرہ کا مطلقاً کوئی بندوبست نہیں، رہنے کے لئے مدرسوں کے حجرے ہیں، جو نہایت مختصر اور تنگ و تاریک ہیں،

مدرسوں کی قطع یہ ہے کہ چھوٹا سا صحن اور اس کے تین طرف چھوٹے چھوٹے حجرے ہوتے ہیں، اور صحن میں سقاوہ ہوتا ہے، جہاں بیٹھ کر وضو کرتے ہیں، بڑے بڑے مدرسے جو سلاطین (محمد فاتح و سلیمان وغیرہ) نے بنوائے تھے اور آج تک قائم ہیں، ان کے حجرے وسیع اور ہوادار ہیں، لیکن اور تمام مدرسوں کے حجرے، ایسے مختصر اور بند بند ہیں کہ اندر جاتے ہوئے دم گھٹتا ہے، باوجود

ان تمام باتوں کے مجھ کو ترکوں کی علمی فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے، کیونکہ ہر چند کم حیثیت سہی تاہم آج سیکڑوں علمی یادگاروں کا وجود تو ہے اور انصاف یہ ہے کہ یہ مدرسے جس زمانہ کی یادگار ہیں، اس وقت کی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ناموزوں بھی نہیں، ہمارے ہندوستان میں تو اس وسعت اور فراخی کے ساتھ کہ بجائے خود ایک اقلیم ہے، حکومت اسلام کی ششصد سالہ مدت کی ایک علمی یادگار بھی موجود نہیں،

نصاب تعلیم

تعلیم قدیم کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ تعلیم کا اسٹینڈرڈ نہایت چھوٹا رکھا گیا ہے، علم ادب کا پتہ نہیں، منطق و فلسفہ میں ایساغوجی اور شمسیہ انتہائی کتابیں ہیں، صحاح ستہ شاید ہی کسی مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہو، معانی و بلاغت و اصول فقہ کا بھی یہی حال ہے، فقہ پر البتہ بہت کچھ توجہ ہے، لیکن اس کی تعلیم بھی مجتہدانہ نہیں بلکہ نہایت عامیانہ اور مقلدانہ ہے، بعض بعض مولویوں سے میری ملاقات تھی، وہ ایسے جزئی اور عام مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے کہ مجھ کو تعجب اور افسوس دونوں ہوتا تھا،

ترکوں کی علمی حالت

اسلام نے دنیا کے جن حصوں پر حکومت کی وہاں کی ملکی زبان اگر بالکل مٹ نہیں گئی تو اتنا ضرور ہوا کہ علمی حیثیت کا منصب اس سے چھن کر عربی زبان کو مل گیا، ہندوستان، فارس، اسپین، افغانستان کی ملکی زبانیں اگرچہ بالکل مختلف تھیں، لیکن علمی زبان ہر جگہ عربی ہی رہی، اور اب

بھی ہے، ترک بھی اس عام اثر سے مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن اس خصوصیت
میں ان کو تمام اسلامی قوموں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے عربی زبان
کی اطاعت کے ساتھ اپنی زبان کو بھی علمی خزانوں سے محروم نہیں ہونے دیا،
جس زمانہ میں علوم قدیمہ کی حکومت تھی اس زمانہ میں ترکی زبان میں ان
علوم کا پورا سلسلہ موجود تھا، اور اب بھی ہے، میں نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا
کہ تاریخ ابن خلدون، طبری، ابن خلکان، مقریزی وغیرہ جو نہایت ضخیم کتابیں
ہیں، اور جن میں سے بعض سات سات جلدوں میں ہیں، ترکی میں سب کا ترجمہ
موجود ہے، بخلاف اس کے فارس و افغانستان میں اس کی ایک نظیر بھی نہیں
مل سکتی، ترکی کی اصلی تصنیفات کے علاوہ ترجمہ شدہ کتابوں کا ذکر کیا جائے تو ایک
بڑی فہرست تیار کرنی ہوگی،

میرے ایک ترک دوست نے جو متعدد زبانوں کے ماہر ہیں مجھ سے بیان واقعہ
کے طور پر (نہ فخریہ) بیان کیا کہ فرنچ زبان کی تاریخیں، ڈرامے، ناول، سفرنامہ
کتب انشا، و بلاغت، اس کثرت سے ترکی میں ترجمہ ہو گئی ہیں کہ یہ کہنا کچھ مبالغہ
نہیں ہے کہ فرانس کا پورا علم ادب ترکی زبان میں آگیا ہے، علوم و فنون جدیدہ
کی بھی سیکڑوں کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، اور اسی کا اثر ہے کہ ٹرکی کے تمام کالجوں
میں، بجز مکتب سلطانیہ کے ان علوم و فنون کی تعلیم ترکی ہی زبان میں ہوتی ہے،
اور اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے،

مستقل تصنیفات کا رواج بھی کچھ کم نہیں، علوم و فنون جدیدہ کی تمام
شاخوں پر کثرت سے کتابیں لکھی جارہی ہیں، اور کالجوں اور اسکولوں میں

جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں عموماً مستقل تصنیفات ہیں نہ ترجمے، مجھ کو اس قدر فرصت اور موقع تو کہاں مل سکتا تھا کہ تمام جدید تصنیفات سے واقفیت حاصل کرتا، البتہ اپنے مذاق کے موافق تاریخ ورجال کی کتابیں دیکھیں، جس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ عربی کے بعد ایشیا کی کسی زبان میں اس قدر تاریخی سرمایہ موجود نہیں ہے،

ترکی میں تاریخی تصنیفات

بلکہ ایک لحاظ سے اس کو عربی پر ترجیح حاصل ہے، عربی زبان میں جس قدر تاریخیں ہیں، سادہ واقعات کا مجموعہ ہیں، اور جس قدر کوشش اور اہتمام ہے صرف اصول روایت کے متعلق ہے، بخلاف اس کے ترکی تاریخیں ان اُصول و قواعد کے موافق لکھی جاتی ہیں، جو فلسفہ تاریخی کے اُصول ہیں اور جس کی بنا پر یورپ نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے، مکتب ملکیہ میں تاریخ کی کتاب جو درس میں داخل ہے، میں نے اُس کو اجمالی طور پر دیکھا تمام واقعات میں علت و اسباب کا سلسلہ ملحوظ رکھا ہے، اور جابجا محاکمہ اور تحقیق و تنقید کی ہے، اس کے ساتھ ہر عہد حکومت کے خاتمہ پر اس عہد کی تمدنی، اخلاقی، علمی حالت تفصیل کے ساتھ دکھائی ہے،

بیوگرفی یعنی رجال و تراجم

بیوگرفی کا ایک نہایت مفید سلسلہ ہے، جس کا نام مشاہیر رجال ہے، مشہور اہل کمال کے حالاتِ زندگی نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے لکھے ہیں، افسوس ہے کہ یہ سلسلہ ناتمام چھوڑ دیا گیا، ورنہ نہایت مفید مجموعہ ہوتا، ایک خاص قسم کی بہت بڑی انسائیکلو پیڈیا آج کل زیر تصنیف ہے، جس کا نام قاموس الاعلام ہے، اس میں رجال کے علاوہ مشہور شہروں اور عمارتوں اور تاریخی مقامات کا تذکرہ ہے، عربی اور فرنچ وغیرہ کی جن تصنیفات سے اس کتاب میں مدد لی گئی ہے، ان کی فہرست اس کے ساتھ شامل ہے، میں نے عربی کتابوں

قاموس الاعلام

کے نام پڑھے، نہایت نایاب اور مستند کتابیں ہیں اور قسطنطنیہ کے سوا اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتیں، یہ کتاب حروفِ تہجی کی ترتیب پر ہے، اور اس وقت تک ز تک پہونچی ہے،

تاریخ کے ساتھ جغرافیہ کو بھی نہایت ترقی ہے، کثرت سے مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، مجموعی دینا اور الگ الگ آبادیوں کے بڑے بڑے نقشے اس کثرت سے تیار کیے گئے ہیں کہ یورپ کے بعد شاید ہی دینا کے کسی حصہ میں ہوں، یہ نقشے نہایت باقاعدہ، خوبصورت اور موزوں ہیں، اور یورپ کے تیار شدہ نقشوں سے کسی بات میں کم نہیں، ترکوں کو اس فن سے خاص دلچسپی ہے،

ترکی تصنیفات کی کثرت کا کافی معیار میں نہیں بتا سکتا، لیکن ایک دفعہ سررشتہ تعلیم کے دفتر میں اجمالی طور پر ان کتابوں کی فہرست دیکھی جو خاص قسطنطنیہ میں صرف ایک مہینے کے عرصہ میں شائع ہوئیں ان کا شمار دو ہزار کے قریب تھا، اگرچہ اس میں ارمنی، یونانی، فرنچ، اور دوسری زبانوں کی کتابیں بھی تھیں، لیکن زیادہ حصہ ترکی تصنیفات کا تھا، البتہ یہ افسوس ہے کہ ان میں ناول اور ڈرامے زیادہ تھے اور یہ وہی بلا ہے جو ہمارے کمبخت ملک میں پھیلی ہوئی ہے،

ٹرکی کے لٹریچر نے بھی نہایت ترقی کی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ بہت سی خصوصیتوں میں ہماری اردو کے مشابہ ہے، ٹرکی کا قدیم لٹریچر قدیم اردو کے انداز پر رنگین، پُر تکلف، استعارات سے مملو اور قوافی کا پابند تھا، لیکن اب نئی . . . .

اردو کی طرح سادگی، صفائی، برجستگی کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور نئی تصنیفات بالکل اسی طرز پر لکھی جاتی ہیں، اس نئی طرز کے موجد یا استاد کمال بک، حامد بک، پروفیسر ناجی وغیرہ ہیں، میں نے جب ترکی پڑھنی شروع کی تو قدیم تصنیفات کے پڑھنے کا ارادہ کیا، لیکن میرے احباب نے جو میرے استاد بھی تھے کہا کہ قدیم وجدید ترکی میں آسمان وزمین کا فرق ہے، اور قدیم زبان کا سیکھنا نئی زبان کے لئے کافی نہ ہوگا، پروفیسر دمیری نے اپنے لکچر میں جو اُنھوں نے ترکوں کی موجودہ شایستگی پر دیا ہے، قدیم وجدید ترکی کا موازنہ کرکے موجودہ زبان کی دلآویزی صفائی، سادگی کا تعجب کے ساتھ اعتراف کیا ہی،

ترک مصنفین

ترک مصنفوں میں جو آج کل زیادہ نامور اور ممتاز ہیں اُن کے نام یہ ہیں، احمد مدحت، جودت پاشا، پروفیسر ناجی، ابو الضیا، ر سامی، علی نصرت، پروفیسر ناجی شاعر ہیں، اور گویا پایہ تخت کے شاعر ہیں، ملک الشعرا، کا یہاں کوئی عہدہ نہیں ہے، ورنہ یہ لقب انہی کو ملتا، تاہم انکو پایہ تخت کا شاعر خیال کیا جاتا ہے،

احمد مدحت بہت بڑا مصنف ہے، اُس نے ترکی حکومت کی نہایت مفصل تاریخ لکھی ہے، جو بارہ جلدوں میں ہے، اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کے جواب میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے، جو تین جلدوں میں ہے، اور مدافعہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہے، وہ ترکی، فارسی، عربی کے علاوہ فرنچ زبان میں کمال رکھتا ہے، یورپ میں جو اورنٹیل کانفرنس قائم ہے، اس کے متعدد اجلاسوں میں ٹرکی کی طرف سے وہ وکیل مقرر ہوکر گیا، اور اسٹاک ہالم کی کانفرنس میں عربی فارسی وغیرہ کی ڈیپارٹمنٹ

کی افسری اسی کو دی گئی،

جودت پاشا نہایت معزز شخص ہیں اور جلسۂ وزرار کے ایک ممبر یعنی وزیر اوریا ور ہیں، ان کا سن ساٹھ ستر کے قریب ہے، اور چونکہ معمر ہونے کے ساتھ ضعیف الجثہ اور نحیف بھی ہیں، جلسۂ وزرا میں کم شریک ہوتے ہیں، ان کی تصنیفات میں سے قواعد عثمانیہ جو ترکی نحو وصرف میں ہے، درس میں داخل ہے، میں ان سے ملا تھا، دیر تک صحبت رہی، عربی و فارسی میں بے تکلف بات چیت کر سکتے ہیں، مجھ سے عربی میں باتیں کرتے رہے، بڑی تعریف یہ ہے کہ باوجود دولت مندی اور عہدۂ وزارت کے نہایت سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور زیادہ تر علمی اشغال میں مصروف رہتے ہیں،

ترکی لٹریچر کے ذکر میں اخبارات اور ماہوار رسالوں کا ذکر کرنا بھی ضرور ہے، کیونکہ آج کل یہ چیزیں لٹریچر کا ایک بڑا اجزو خیال کی جاتی ہیں ہیں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے ترکی لٹریچر پستی کی حالت میں ہے، ترکی زبان کے اخبار تعداد میں تھوڑے نہیں ہیں، بہت سے اخبار روزانہ ہیں، اور بڑی آب وتاب سے نکلتے ہیں، عبارت بھی بہت سادہ اور شستہ ہوتی ہے، اخبار کا مذاق بھی تمام ملک میں پھیل گیا ہے، بہت سے قہوہ خانے اخباروں کے لئے مخصوص ہیں، جہاں ہمیشہ کثرت سے اخبارات موجود رہتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کو قہوہ خانے کے بجائے قرات خانہ کہا جاتا ہے،

یہ سب کچھ ہے، لیکن جو چیز اخبار کی جان ہے یعنی آزادی اس کا سرے سے وجود نہیں، تمام اخبارات میں بجز سرکاری احکامات اور معمولی خبروں

کے اور کچھ نہیں ہوتا، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ترکی زبان پولیٹکل طرزِ تحریر اور زورِ استدلال
سے بالکل محروم ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس زبان میں آزادی کا عنصر نہ ہو، اس
میں رفعتِ خیال، قوتِ بیان، زورِ کلام، جوشِ تاثیر، کیونکر اور کہاں سے آسکتا ہے،
عربی کو دیکھو جب تک خلافت راشدہ کا زمانہ تھا، اور طبیعتیں آزاد اور خودسر تھیں،
عربی زبان جوش اور تاثیر سے لبریز تھی، جس زمانہ سے شخصی حکومت کی بنیاد پڑی،
اور خاندانِ بنو امیہ نے بڑے زور اور قوت سے عربی کی آزادی کو پامال کر دیا،
زبان میں نہ وہ تاثیر رہی نہ وہ جوش رہا، بے شبہہ زمانہ مابعد کا لٹریچر کثرتِ معلومات
کی وجہ سے نہایت وسیع اور دولت مند ہے، لیکن اس زمانہ کی تمام تصنیفات
چھان مارو آزادانہ طرز تحریر اور پولیٹکل جوش اور تاثیر کا پتہ نہیں ملتا،

اخبارات کے آزاد نہ ہونے کا سبب

ان باتوں کے ساتھ مجھ کو یہ تسلیم کرنا ضرور ہے کہ اخبارات کا آزاد نہ
ہونا ترکی پولیٹکل حالات کا ضروری اقتضا ہے، رعایا کا اختلافِ مذہب، سلطنت
ہائے غیر کی رقابت، مخالفین کی دراندازیاں، اخباروں کا بات کو تبنگڑ بنانا،
یورپین حکومتوں کی ہمسائگی، یہ ایسے حالات ہیں جن میں آزاد گورنمنٹ بھی یہی
کرتی جو ترکی نے کیا ہے، حال ہی میں فرانس کی جمہوری حکومت نے ٹونس میں
اخبارات کی آزادی کے متعلق جو احکام جاری کئے، اُن کو دیکھ کر کون ناانصاف ہے
جو تنہا ترکی کو موردِ الزام قرار دے سکتا ہے،

کتابوں کے چھپنے میں روک ٹوک

البتہ کتابوں کے چھپنے کے متعلق یہاں جو روک ٹوک ہے وہ کسی قدر
اعتراض کے قابل ہے، یہاں عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی کتاب قدیم
یا جدید چھاپنا چاہتا ہے، تو پہلے وہ کتاب معارف کے سررشتہ میں پیش

کی جاتی ہے، وہاں معائنہ اور تفتیش کا ایک جداگانہ صیغہ ہے، اس صیغہ کے عہدہ دار
کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھ جاتے ہیں، اور ان کی رپورٹ کے موافق بعض اوقات
کتاب کا چھاپنا روک دیا جاتا ہے، یا اس میں حک واصلاح کی جاتی ہے، اس قاعدے
کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ بعض لوگ کتابوں کے چھاپنے میں نہایت بددیانتی
کرتے تھے، مثلاً بیروت میں عیسائیوں نے الفاظ الکتابیہ جو چھاپی، اس میں
جہاں جہاں قرآنِ پاک کی آیتیں تھیں، اور اسلامی طریقہ کے موافق عنوان
کے طور پر قال اللہ یا کما فی القرآن المجید، تھا، سب جگہ بدل کر کما
قیل یا کما قال القرآن بنا دیا حالانکہ کسی مسلمان کے قلم سے قرآن مجید کی نسبت
ایسے الفاظ نہیں نکل سکتے، اس سے زیادہ یہ کہ ان ہی عیسائیوں نے قرآن مجید
کا ایک انتخاب چھاپا ہے، اور جہاں جہاں کسی آیت میں عیسائی روایتوں کے
خلاف کسی واقعہ کا ذکر ہے، قوسین میں لکھدیا ہے، کہ "یہ غلط ہے اور صحیح یوں ہے"
بے شبہہ ایک اسلامی سلطنت اس قسم کے تصرفات کا تحمل نہیں کر سکتی اور
یہی سبب ہے کہ سلطنت کی طرف سے کتابوں کے شائع ہونے کے وقت نہایت
احتیاط اور تفتیش سے کام لیا جاتا ہے،

لیکن افسوس ہے، کہ آج کل اس کا طریق عمل اعتدال سے تجاوز
کر گیا ہے، یہ صیغہ تحریف وتبدل کے روک کی غرض سے قائم ہوا تھا، مگر بعض
اوقات اُس نے خود تحریف و تغیر پر عمل کیا ہے، ایک مطبع میں شرح
عقائد النسفی چھپ رہی تھی، معارف نے اس کتاب کی تمام وہ عبارت قلم زد
کر دی تھی، جس میں خلافت کی بحث ہے، اور الائمۃ من قریش کی حدیث مذکور ہے

ہے، مطبع والے نے مجبوراً اسی قلمزد نسخہ کو چھاپا، میں نے اصل نسخہ جس پر معارف نے یہ تصرف کیا تھا دیکھا اور مجھ کو یاد ہے کہ اس وقت میں رنج اور غصہ کی وجہ سے بے اختیار ہو گیا تھا، ان لوگوں نے یہ تصرف بخیالِ خود سلطان کی ہوا خواہی کے جوش میں کیا ہوگا، لیکن اگر حضور ممدوح کو اس سے اطلاع ہوتی تو وہ ہرگز اس کو پسند نہ کرتے،

اخبارات تو جیسا میں نے اوپر بیان کیا قابلِ اعتنا نہیں لیکن میگزین اور ماہوار رسالے جو ترکی زبان میں نکلتے ہیں، نہایت قدر کے قابل ہیں، ان میں زیادہ مشہور اور معروف معارف ہے، جو ہفتہ وار نکلتا ہے، اس رسالہ میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کے مضامین لکھے جاتے ہیں، اور ترکوں میں آج کل جو لوگ علومِ جدیدہ کے ماہر ہیں، زیادہ تر اسی رسالہ کے ذریعہ سے اظہارِ کمال کرتے ہیں، مضامین زیادہ تر نیچرل سائنس اور آلاتِ جدید کے متعلق ہوتے ہیں اور کوئی پرچہ تصویر سے خالی نہیں ہوتا تعداد اشاعت بھی کچھ کم نہیں، میں نے صاحبِ مطبع سے دریافت کیا تھا، معلوم ہوا کہ پانچ ہزار پرچے نکلتے ہیں، معارف کے سوا اور بھی علمی پرچے ہیں، اور نہایت قابلیت سے شائع ہوتے ہیں، ان میں رسلی غزتہ، مصور جہاں، ثروت فنون میری نگاہ سے گذرے ہیں، یہ تمام رسالے کاغذ، خط، صفائی، غرض ظاہری آب و تاب میں یورپ کے مشہور رسالوں کی ہمسری کرتے ہیں،

اس میں شبہہ نہیں کہ ترکی میں علوم و فنون کو جو روز افزوں ترقی ہے اور جس کثرت سے ہر فن میں نئی تصنیفات شائع ہوتی رہتی ہیں، اس کے

لحاظ سے تمام ایشیائی دنیا پر اس کو افضلیت کا رتبہ حاصل ہی،

چھاپہ خانے

چھاپے خانے یہاں کثرت سے ہیں، اور خوش خطی، صفائی، موزونی میں ان کا جواب نہیں، عربی خط کا جو ٹائپ ہے، اور جو ایک ترکی عالم ابو الضیا کی ایجاد ہے دنیا میں بے نظیر خیال کیا جاتا ہے، عربی کتابیں آج دنیا میں جہاں جہاں چھپتی ہیں، بیروت کی چھپی ہوئی کتابیں سب سے عمدہ تر تسلیم کی جاتی ہیں، لیکن خود بیروت والوں نے مجھ سے بیان کیا، کہ اصل میں یہ ٹائپ ترکوں کی ایجاد ہے، اور ہم اُن کے مقلد ہیں، چونکہ قسطنطنیہ میں عموماً ترکی کتابیں چھپتی ہیں، اور وہ ان ملکوں میں نہیں آتیں، اس لئے عام طور پر بیروت ہی کی شہرت ہو گئی ہے، مرفہ الحالی یا عام قدر دانی کا اثر ہے، کہ قسطنطنیہ میں جس قدر کتابیں چھپتی ہیں، نہایت عمدہ اور قیمتی کاغذ پر چھپتی ہیں، بخلاف مصر و ہندوستان کے جہاں جوتے صاف کرنے کا کاغذ کتابوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ان ملکوں میں لوگوں نے ابھی تک علم کی قدر و قیمت نہیں سمجھی،

یہ افسوس کی بات ہے کہ یہاں کوئی مطبع اتنا وسیع اور اس قدر دولتمند نہیں جیسا کہ ہندوستان میں نولکشوری مطبع ہے، اس کے ساتھ یہ اور افسوس ہے، کہ اکثر مطابع غیر قوموں کے ہیں، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اس کا مالک بھی ایک عیسائی ہے، مسلمانوں کے جو مطابع ہیں، ان میں ترجمان حقیقت، مطبع

عثمانیہ، شرکتِ صحافیہ زیادہ ممتاز ہیں، میں نے ان سب کی سیر کی، شرکتِ صحافیہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ مشترک سرمایہ سے قائم ہے، اور اس کے تمام حصہ دار مسلمان ہیں، کل سرمایہ ۱۸ہزار پونڈ یعنی قریبًا ۲ لاکھ روپیہ ہے، تمام کام انجن کے ذریعہ سے ہوتا ہے، انجن بہت بڑا ہے اور دس بارہ کلوں کو چلاتا ہے، میں جس وقت پہنچا عینی شرح بخاری چھپ رہی تھی، دو ضخیم جلدیں اس وقت تک تیار ہو چکی تھیں، مطبع والے کہتے تھے، کہ ایسی ہی آٹھ اور ہیں، تمام قسطنطنیہ میں مسلمانوں کا یہی مشترک کارخانہ ہے، ورنہ مسلمان اولاً تجارت کو ہاتھ ہی کیوں لگاتے، اور کسی اتفاقی وجہ سے اس کام کو کرتے بھی تو دو چار شخص مل کر کیوں کرتے، اس لحاظ سے یہ مطبع ایک گونہ خرقِ عادت میں داخل ہے،

کتب خانے

ترتیبِ مضمون اور نسقِ کلام کی وجہ سے میں اس عنوان پر دیر میں پہونچا، ورنہ ذاتی شوق اور غایتِ سفر کے لحاظ سے یہی مضمون تھا جس کو میں سب سے اول اور سب سے مفصل لکھتا، حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کے علمی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ فخر ہے، وہ یہی کتب خانے ہیں، اسلامی دنیا کے جن حصوں میں آج تعلم و تعلیم کا چرچا ہے، وہ ہندوستان، عرب، مصر، شام، بلادِ مغرب، فارس و ایران ہیں، ان میں سے اکثر مقامات کا علمی سرمایہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور جو نہیں دیکھا ہے وہ ایسے قوی وسائل سے معلوم ہے کہ دیکھنے کے برابر ہے، اس بنا پر میں کافی یقین کے ساتھ کہہ سکتا

ہوں کہ تمام اسلامی دنیا میں قسطنطنیہ عربی تصنیفات کا سب سے بڑا مرکز ہے،

کل کتب خانے جو اس شہر میں ہیں ان کی تعداد ۵۴ ہے، شاہی کتب خانہ جو قصر ہمایوں میں ہے اور نہایت قدیم ہے ان کے علاوہ ہے، ان کتب خانوں کی کل کتابیں ۵۰ ہزار ہیں، اگرچہ یہ تعداد کچھ بڑی تعداد نہیں، ہمارے ہندوستان میں اس سے زیادہ کتابیں ہونگی، لیکن قسطنطنیہ کو جو ترجیح ہے وہ کتابوں کی عمدگی اور کمیابی کی حیثیت سے ہے، ان کتب خانوں میں سے چند کے نام ذیل میں درج ہیں، کتب خانہ جامع ایا صوفیہ، کتب خانہ جامع بایزید، کتب خانہ جامع یول، کتب خانہ حمیدیہ قدیم، کتب خانہ عاشر آفندی شیخ الاسلام، کتب خانہ اسعد آفندی نقیب الاشراف، کتب خانہ جامع محمد فاتح، کتب خانہ حمیدیہ جدید، کتب خانہ علی پاشا شہید، کتب خانہ نور عثمانیہ، کتب خانہ لالہ لی، کتب خانہ حکیم اُغلی علی پاشا، کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی، کتب خانہ قلیج علی پاشا، کتب خانہ ولی الدین آفندی، کتب خانہ سلیمیہ، کتب خانہ فیض اللہ آفندی، کتب خانہ سلطان محمد قاضی زادہ، کتب خانہ جامع والدہ سلطان، کتب خانہ عاطف آفندی، کتب خانہ شہزادہ داماد ابراہیم پاشا، کتب خانہ خسرو پاشا، کتب خانہ مہرشاہ سلطان، کتب خانہ محمد آفندی، کتب خانہ مصطفی آفندی، کتب خانہ توفیق آفندی، کتب خانہ سلیمانیہ، کتب خانہ محمد آفندی مراد، کتب خانہ راغب پاشا، ان میں سے چودہ کتب خانوں کی مفصل فہرستیں چھپ کر شائع ہو گئی ہیں، اور غالباً رفتہ رفتہ بقیہ فہرستیں بھی اشاعت پائیں،

یہ کتب خانے جیسا کہ خود اُن کے ناموں سے ظاہر ہے، اگلے پاشاؤں

اور امیروں نے قائم کئے ہیں، اور سب کے سب وقفِ عام ہیں، ہر کتب خانہ کے
ساتھ اس قدر جائداد بھی وقف ہے، جس سے اس کے معمولی مصارف یعنی مکان
کی تجدید و ترمیم، فرش اور معمولی فرنیچر، ملازموں کی تنخواہ ادا ہوتی رہتی
ہے، ان امور کے لحاظ سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ علمی فیاضی میں ترکوں کا رتبہ
تمام اسلامی قوموں سے بالاتر ہے، ہندوستان میں مدتوں تک اسلامی
حکومت رہی، اور بڑے اوج و شان سے رہی، بڑے بڑے نامور وزرا اور امرا
گذرے، لیکن آج اُن کی ایک بھی علمی یادگار موجود نہیں،

ان کتب خانوں سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ ترکوں میں اُمرا کا
گروہ (جو اور قوموں میں نسبتًہ ایک جاہل گروہ ہوتا ہے) تعلیم یافتہ اور اعلیٰ
درجہ کا تعلیم یافتہ تھا، اکثر کتب خانوں میں وقف کرنے والوں کی ذاتی تصنیفات
یا ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں، جو اُن کے مذاق اور وسعتِ نظر
کی شاہد ہیں، اس کے علاوہ جس قسم کی عمدہ اور نایاب کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈکر
جمع کی گئی ہیں، خود ان سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے، کہ جمع کرنے والوں کا
علمی مذاق معمولی مذاق نہ تھا،

کتب خانوں کی ظاہری.

یہ کتب خانے خوبی عمارت اور دیگر سر و سامان کے لحاظ سے معمولی درجہ
کے ہیں، یہاں تک کہ بعض کتب خانوں میں الماریاں تک نہیں، ایک چبوترہ پر
جس کے گرد لوہے کا کٹہرہ ہے، کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، تمام کتب خانوں
میں زمین کا فرش ہے، البتہ اس قدر تکلف ہے کہ سامنے بنچیں بچھی ہوئی ہیں
جن پر کتابیں رکھ کر پڑھتے ہیں، کتب خانہ حمیدیہ جو حال میں قائم ہوا ہے اور

سلطان المعظم کے عہدِ مبارک کی یادگار ہے، اگرچہ زیادہ شان وشوکت کا ہی، عمارت خوبصورت اور وسیع ہے، میز، کرسیاں، کوچیں، جس قدر ہیں ان پر ریشمی گدے ہیں، غرض تمام باتوں میں اور کتب خانوں سے مستثنیٰ ہے، تاہم الہ آباد کی پبلک لائبریری کی برابری نہیں کرسکتا،

انتظام

چونکہ تمام اوقاف کا انتظام حکومت سے متعلق ہے، کتب خانے بھی گورنمنٹ کے زیرِ اہتمام ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ باوجود امتدادِ زمانہ کے کتابیں اس احتیاط سے محفوظ ہیں کہ ایک پرچہ بھی ضائع نہیں ہونے پایا ہے، ملازمین باوجود قلتِ تنخواہ کے نہایت متدین اور راست کردار ہیں، کتب خانہ عاشر آفندی کا وقف اس قدر کم ہے کہ لائبریرین کو معمولی خوراک اور دو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے، لیکن جو شخص لائبریرین مقرر کیا گیا ہے، اس قدر دیانت دار اور اپنے فرائض کا پابند ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں، کتب خانہ کی دیواروں پر انگور کی بیلیں چڑھی ہیں، ایک دن میں نے اُس سے کہا کہ اگر تم انگوروں کو بیچ ڈالو تو تم کو معقول آمدنی ہوسکتی ہے، بولا کہ واقف کی شرط کے موافق یہ انگور صرف ان لوگوں کے لئے ہیں، جو کتب خانہ میں کتاب پڑھنے کی غرض سے آئیں، اس لئے میں اُن سے کسی طرح کا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، قلتِ تنخواہ کی وجہ سے بیچارے نے شادی بھی نہیں کی ہے، نہ رہنے کا کوئی مکان ہے، کتب خانہ ہی میں رات کو پڑ رہتا ہے،

ض

ان کتب خانوں کی خصوصیتیں، اور ان کی اجمالی کیفیت واقعاتِ ذیل سے معلوم ہوگی،

نسخوں کی صحت اور عمدگی،

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کتابیں جو یہاں موجود ہیں، عموماً قدیم الخط، صحیح اور اساتذۂ سابقہ کی صحیح کردہ ہیں، قدیم اور نایاب کتابیں جن کے دو ہی چار نسخے دنیا میں ہوں ان کا صحیح ہونا سب سے زیادہ مقدم ہے، ورنہ ان پر اعتبار نہیں ہو سکتا، مصر کے کتب خانہ میں بھی قدیم کتابیں کچھ کم نہیں، لیکن اکثر زمانۂ حال کی لکھی ہوئی ہیں، اور اس وجہ سے چنداں صحیح اور قابلِ استناد نہیں، قسطنطنیہ کی کتابوں کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے، کہ ان کتابوں کے ایسے عجیب و غریب نسخے کہاں سے بہم پہونچائے ہیں، اسرار البلاغت عبد القاہر الجرجانی کی مجھ کو مدت سے تلاش تھی، ہندوستان میں صرف ایک نسخہ کا پتہ لگا، لیکن وہ نہایت غلط اور ناقابلِ اعتبار تھا، قسطنطنیہ میں اس کے متعدد نسخے دیکھے اور سب کے سب نہایت صحیح اور قدیم الخط، اسی طرح کتاب البیان والتبیین للجاحظ، تذکرہ ابن حمدون، معجم الادبار یاقوت حموی کتاب الاشراف للبلاذری، تاریخ کبیر امام بخاری وغیرہ کے نسخے نہایت صحیح اور مستند موجود ہیں،

خط کی عمدگی اور کاغذ کی زرافشانی

(۲) بعض کتب خانوں مثلاً حمیدیہ قدیم میں یہ خصوصیت ہے کہ اکثر کتابوں کا کاغذ زریں یا زرفشاں ہے اور حاشیہ پر سنہری بیل بوٹے بنے ہیں، ان تکلفات کے ساتھ خط نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے، چونکہ قدیم زمانہ کی کتابیں اس تکلف کے ساتھ کم مل سکتی تھیں، بانیٔ کتب خانہ نے اکثر کتابیں خود اپنے اہتمام سے تیار کرائی ہیں، میں نے متعدد کتابیں جن میں شفا بوعلی سینا کا کامل نسخہ بھی تھا، نکلوا کر دیکھا اور صاحبِ کتب خانہ کی نفاست پسندی

کی بے ساختہ داد دی،

(۳) میرا خیال تھا کہ دولت عباسیہ کے عہد میں یونانی و مصری کتابوں کے جو ترجمے ہوئے تھے دنیا سے ناپید ہو گئے، لیکن یہاں آکر اس خیال کی غلطی ثابت ہوئی، اگرچہ جس کثرت سے ترجمے ہوئے تھے اس کے اعتبار سے تو موجودہ سرمایہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، تاہم جس قدر موجود ہے یہ بھی غنیمت ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کو قدیم تصنیفات کے ساتھ خاص اعتنا تھا، چنانچہ اُنھوں نے اس باب میں یورپ کی کوششوں سے بھی فائدہ اٹھایا، ابن رشد نے ارسطو کی تصنیفات کا ایک نہایت مفید اور جامع خلاصہ لکھا تھا، یہ اصلی خلاصہ مفقود ہو گیا ہے، لیکن لاٹین میں اس کا ترجمہ ہو گیا تھا، جو اس وقت تک یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہے، اسعد آفندی ایک ترکی عالم نے اس لاٹین خلاصہ کا عربی میں ترجمہ کیا، اور جابجا کچھ اضافے کئے ہیں نے یہ ترجمہ راغب پاشا کے کتب خانہ میں دیکھا، بہت بڑا مجموعہ ہے، اور ترکوں کی علمی کوششوں کا عمدہ نمونہ ہے،

(۴) فن تاریخ و ادب میں بعض ایسی تصنیفات دیکھیں جن میں وہ جدت ہے، جس کو میں مدت سے تلاش کرتا تھا، اور یورپ کی تصنیفاتِ حال کے سوا اس قسم کی طرز تصنیف کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا، مثلاً قضاۃ کے حالات میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں، لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی، کہ حالاتِ زندگی کے ساتھ ان کے فیصلے اور احکام بھی نقل کرتا کہ آج طریقۂ انفصال مقدمات کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جا سکتا، کتب خانہ بنی جامع میں اس قسم کی ایک کتاب موجود ہے

مصنف کتاب کا نام ابوبکر محمد بن خلف وکیع ہے، جو نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اور تمام واقعات کو بسند متصل بیان کرتا ہے، اس کتاب میں التزام کیا ہے کہ ہر شخص کے حال کے ساتھ اس کے بہت سے فیصلے اور تجویزیں بھی نقل کی ہیں اور مقدمات کی صورت بیان کی ہے،

فن ادب میں میں نے اس قسم کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی، بلکہ خیال تک نہ تھا کہ ایسی کوئی کتاب مسلمانوں نے کبھی لکھی ہوگی، جس میں مضامین شعری کی تاریخ ہو، یعنی فلاں مضمون، اول فلاں شاعر نے لکھا، پھر رفتہ رفتہ فلاں فلاں شاعر نے یہ یہ اضافہ کیا، یا اس طرح اس کی صورتیں بدلیں، عاشر آفندی کے کتب خانہ میں میں نے ایک بڑی ضخیم کتاب خاص اس موضوع پر دیکھی، مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین عرب جاہلیۃ نے ایجاد کئے، پھر متاخرین نے ان کو ترقی دی، اور نئے نئے پیرائے نکالے تمام کتاب اسی دعویٰ کے ثبوت میں ہے، مصنف ہر مضمون کے لئے عرب جاہلیۃ کا ایک شعر نقل کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ اسلامی شعرا میں فلاں شاعر نے اسی مضمون کو ذرا بدل کر اس طرح لکھا، پھر دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے شعرا نے اُسی سے اور اور صورتیں پیدا کیں، اس کتاب کو پڑھکر مصنف کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے، اور ساتھ ہی افسوس ہوتا ہے، کہ متاخرین اس قسم کی نادر تصنیف کی پیروی نہ کرسکے، کہ آج اس مضمون پر متعدد کتابیں ملتیں،

حکما اور ائمہ کی تصنیفات

(۵) مشہور حکما اور ائمہ فن کی کتابیں جس کثرت سے یہاں موجود ہیں اور کہیں نہیں مل سکتیں، امام غزالی، بو علی سینا، فخر رازی، فارابی کی وہ

کمیاب تصنیفات جن کے نام صرف ابن خلکان وغیرہ کے ذریعہ سے معلوم ہیں اکثر یہاں موجود ہیں، معارف وحقیقت کے متعلق بوعلی سینا اور حضرت سلطان ابوسعید ابو الخیر کی آپس میں جو خط وکتابت وقتاً فوقتاً ہوئی ہے وہ رسالوں کی شکل میں موجود ہے،

ابن سینا کی نسبت یہ امر مدتوں سے بحث طلب ہے کہ اُس نے فلسفۂ یونانی پر کچھ اضافہ کیا ہے یا نہیں، کتاب الشفا میں اُس نے لکھا ہے کہ "میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ارسطو کا فلسفہ ہے، اپنے خاص فلسفہ کو میں نے حکمتِ مشرقیہ میں لکھا ہے" یورپ والوں کو اس کتاب یعنی حکمتِ مشرقیہ کی نہایت تلاش ہے، اور چونکہ ان کو یہ کتاب نہیں مل سکی اس لئے پروفیسر منک نے اپنی کتاب ربط فلسفۃ الیہود والاسلام میں لکھا ہے، "کہ حکمۃ مشرقیہ ہم کو ملتی نہیں، اور اور جو کتابیں ملتی ہیں، ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابن سینا نے کچھ اضافہ نہیں کیا"، کتب خانہ جامع ایاصوفیہ میں اس نایاب کتاب کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے، مسلمان تو اس کے پڑھنے اور فلسفۂ یونانی سے موازنہ کرنے کی زحمت کب گوارا کرتے لیکن اگر یورپ والوں کو یہ کتاب مل جاتی تو کچھ شبہہ نہیں کہ اس بحث کا کہ مسلمانوں نے فلسفۂ یونانی میں کچھ اضافہ کیا یا نہیں، قطعی فیصلہ ہو جاتا، میں نے قلتِ فرصت کی وجہ سے اس کتاب کو سرسری طور پر دیکھا، بظاہر اس میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوتی تھی، زیادہ تدقیق کی نگاہ سے دیکھنے کا موقع ہوتا تو کچھ رائے قائم ہو سکتی،

تاریخ اور ادب کی نایاب کتابیں جو میں نے یہاں دیکھیں ان میں سے چند

کے نام ذیل میں درج ہیں، تاریخ خطیب بغدادی تمام و کمال، تاریخ اسلام از علامہ ذہبی ۸ مجلد، تاریخ الحکما از جمال الدین القفطی، تاریخ الکبیر امام بخاری ۴ مجلد، تجارب الامم ابن مسکویہ، منتظم لابن جوزی، مراۃ الزمان بسط ابن الجوزی، مسالک الابصار لابن فضل اللہ ۱۰ مجلد، عقد الجمان لبدر الدین العینی ۱۸ مجلد، مختصر تاریخ دمشق ابن عساکر بجمال الدین بن مکرم الانصاری ۴ مجلد، رحلۃ ابن خلدون، نہایت الارب للنویری طبقات الادبا لیاقوت الحموی، طبقات کبریٰ لابن سعد، طبقات الامم لابن صاعد الاندلسی، کتاب الاشراف للبلاذری تمام و کمال، سیرۃ العمرین لابن الجوزی کتاب البیان والتبیین للجاحظ، صناعتین للعسکری، دلائل الاعجاز لعبد القاہر الجرجانی، تذکرہ ابن حمدون، شرح تبریزی بر دیوان ابو تمام، دیوان ابو نواس مکمل، سرقات المتنبی لابن العمید، مجموعہ رسائل ابو اسحٰق صابی،

کتبخانوں سے یہاں کے باشندوں کا متمتع نہ ہونا

کتب خانوں کے ذکر میں مجھ کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ نایاب کتابیں یہاں بالکل بے کار ہیں، اولاً تو یہ کتب خانے دن میں صرف دو تین گھنٹے کے لئے کھلتے ہیں، اس کے ساتھ سال میں دو تین مہینے متصل تعطیل رہتی ہے، ان باتوں کے ساتھ اعلیٰ مذاق کی یہ کمی ہے کہ نایاب اور قدیم کتابیں یوں ہی پڑی رہتی ہیں کوئی شخص اُن کو اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، کتب خانوں میں میں جب لوگوں کو کتابوں کے مطالعہ میں مشغول دیکھتا تھا، تو ہمیشہ دریافت کرنا چاہتا تھا، کہ کس قسم کی کتابیں ان کے پیش نظر ہیں، لیکن میں نے کسی کے سامنے مختصر معانی، ایساغوجی، شرح وقایہ جلالین وغیرہ کے سوا کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی، البتہ کبھی کبھی غیر ملکوں کے نامور علما نکلتے ہیں، تو ان کو نایاب اور عمدہ کتابوں کی جستجو رہتی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ کل دنیائے اسلامی میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہو گیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی جس کا یہ نتیجہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے، اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے، آئندہ اس کی بھی امید نہیں،

تنبیہ - میں نے کتب خانوں کے بیان میں جو تفصیل کی وہ ایک خاص غرض سے کی اور میں چاہتا ہوں کہ قوم کو اس کی طرف متوجہ کروں، یورپ میں اس قسم کی متعدد انجمنیں قائم ہیں، جن کا مقصد قدیم عمدہ کتابوں کا بہم پہونچانا اور اُن کو چھاپ کر شائع کرنا ہے، انہی انجمنوں کی بدولت عربی زبان کی وہ قدیم اور نادر الوجود کتابیں ہم کو میسر آئی ہیں، جن کے دستیاب ہونے کا خیال بھی نہیں آتا تھا، یہی انجمنیں ہیں جنھوں نے تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری کا کامل نسخہ بہم پہونچایا، اور اس کی بہت سی جلدیں چھاپ کر شائع کیں، حالانکہ مصر و روم کے علماء اس نایاب تاریخی خزانہ سے بالکل نا اُمید ہو چکے تھے، اور شاہ عبد العزیز صاحب نے تو یقین دلایا تھا، کہ وہ دنیا سے ناپید ہو چکی، بے شبہہ یورپ کا یہ بہت بڑا احسان ہے، اور ہم کو اس کا علانیہ اقرار کرنا چاہئے، بزرگانِ قوم سے میری درخواست ہے کہ وہ اس قسم کی ایک عظیم الشان انجمن بنائیں، عام چندے سے کافی سرمایہ جمع کیا جائے، قابل اور لائق مصنفین، کتابوں کے انتخاب کے لئے ممبر مقرر ہوں، قسطنطنیہ اور مصر سے کتابیں نقل کرا کر منگائی جائیں، اور چھاپ کر شائع کی جائیں، یہ کام بظاہر عظیم الشان اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے لیکن

فی الحقیقت ایسا نہیں ہے، اگر چار کروڑ مسلمانوں میں سے ۱۰۰۰ مسلمان بھی آمادہ ہو جائیں اور ایک قلیل مقدار چندے کی دینا گوارا کریں تو اس کام کا انجام پانا کچھ مشکل نہیں، حیدرآباد میں دائرۃ المعارف الدکینیہ کے نام سے جو انجمن قائم ہے اور جس کے ایک معزز ممبر نواب اقبال یار جنگ بہادر ہیں، ہم کو امید ہے کہ وہ ہماری گذارش پر توجہ کرے گی، ہم شکر گذاری کے ساتھ اس کی علمی فیاضیوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہمکو اس سے زیادہ فیاضیوں کی ضرورت ہے، اور ہم کو امید ہے کہ دائرۃ المعارف اور زیادہ توجہ اور اہتمام سے اس مقصد پر متوجہ ہو گی،

زوایا یا خانقاہیں

زوایا

خانقاہیں جن کو یہاں تکیہ اور تکایا کہتے ہیں، نہایت کثرت سے ہیں، اخیر رپورٹ جو مرتب ہوئی ہے، اُس میں ۳۰۵ خانقاہوں کے نام مع تفصیل مقام و دیگر حالات کے درج ہیں، لیکن خانقاہ کے لفظ سے وہ معنی مقصود نہیں جو ہمارے ملک میں مستعمل ہیں، ان ممالک میں یہ ایک عجیب فیاضانہ طریقہ ہے جو درحقیقت حیرت انگیز ہے، تمام بڑے بڑے شہروں میں ہر ملک اور ہر فرقہ کے لئے جدا جدا خانقاہیں ہیں، اس ملک اور فرقہ کا مسافر وہاں آنکلتا ہے، تو بغیر کسی قسم کی روک ٹوک کے خانقاہ میں جا سکتا ہے، اور جب تک چاہے، قیام کر سکتا ہے کھانا اور ایک وقت کی چائے مفت ملتی ہے، یہ فیاضی یہاں تک عام ہے کہ باوجود بُعد مسافت اور بے تعلقی کے قسطنطنیہ، دمشق، بیت المقدس، حلب، موصل، دیار بکر، ان تمام مقامات میں ہندوستانیوں کے لئے جدا خانقاہیں

ہیں، اور اُن کے لئے گوشت اور جنس کی ایک مناسب مقدار مقرر ہے،

یہ خانقاہیں امرا اور رئیسوں نے قائم کی ہیں، اور اس قدر جائداد وقف کر دی ہے، جس سے مقرر مصارف ہمیشہ ادا ہوتے رہتے ہیں، ہر خانقاہ میں ایک شیخ ہوتا ہے، جس کو معقول تنخواہ و خوراک ملتی ہے، اور خانقاہ کا تمام انتظام اس سے متعلق رہتا ہے، میں نے متعدد خانقاہوں کی سیر کی، بعض بعض کی عمارات خوش فضا اور موزوں ہے، کھانے کی نوعیت اور مقدار بھی کافی ہے خاص قسطنطنیہ کی خانقاہوں کے سالانہ مصارف کا تخمینہ چار پانچ لاکھ سے کم نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت ترکوں کی فیاضی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ جس زمانہ میں یہ طریقہ قائم ہوا تھا، اس عہد کے لحاظ سے نامناسب بھی نہ تھا،

تم نے عربی تاریخوں میں پڑھا ہوگا کہ تمام ممالکِ اسلامی میں سیاحوں اور طالب علموں کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے، وہ انہی خانقاہوں اور زاویوں کی بدولت تھا، ابن بطوطہ کو اپنے عالمگیر سفر میں اسی طریقہ کی وجہ سے مدد ملی تھی، چنانچہ اُس نے سفرنامہ میں ان زاویوں کو نام بنام لکھا ہے لیکن، یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں، تو مفید تدبیریں مضر بن جاتی ہیں، مسلمانوں کو سیر و سیاحت، جغرافیانہ تحقیقات، تحصیلِ علم کا مذاق تو جاتا رہا، اس لئے اب یہ طریقہ کاہلی، مفت خوری، دریوزہ گری کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے، اور قومی زندگی کو نہایت نقصان پہونچا رہا ہے، میں نے اکثر خانقاہوں میں خود جا کر دیکھا، کئی کئی برس کے آئے ہوئے مسافر پڑے ہیں، نہ کسی قسم کا

شغل ہے نہ کچھ کام ہے، لکھنؤ کے احدیوں کا جو حال سنا کرتے تھے، یہاں آنکھوں سے نظر آتا ہے، شیوخ جن کو خانقاہ کا انتظام سپرد ہوتا ہے، اور تمام نقد جنس ان کے اہتمام میں رہتی ہے، عموماً خائن اور بددیانت ہیں، خود نہایت آرام و عیش سے بسر کرتے ہیں اور مسافروں کے لئے جو مقدار مقرر ہے اس کا آدھا، تہائی، چوتھائی بھی ان کو نہیں دیتے، ہندی خانقاہ کے شیخ ایک صاحب ہیں، اُنھوں نے کئی بیویاں کر لی ہیں، خانقاہ سے الگ ایک مکان بنوا لیا ہے، اکثر وہیں رہتے ہیں، ڈھائی سیر گوشت جو روزانہ خانقاہ کے لئے مقرر ہے، وہ قریباً کل حضرت کے تصرف میں آتا ہے، اور مسافروں کو معمولی کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا، خانقاہ کی عمارت جا بجا سے ڈھے چلی ہے، صحن میں ایک کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا ہے، مختصر یہ کہ وحشت اور ویرانی کی پوری تصویر ہے، میں نے اور جن خانقاہوں کو دیکھا وہ اگرچہ ہندی خانقاہ سے ہر بات میں بہتر تھیں، لیکن دیانت اور راست بازی کا پتہ کہیں نہیں ملتا، اس طرح کئی لاکھ سالانہ کی رقم نہایت بُری طرح برباد ہوتی ہے،

مساجد جامع اور مشہور مقامات

جامع مسجدوں کی کثرت اور ان کی خوبی عمارت اور عظمت و شان کے لحاظ سے قسطنطنیہ دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، محمد فاتح کے عہد سے جو اس دار الخلافہ کا پہلا تخت نشین تھا، آج تک جس قدر فرماں روا گذرے ہر ایک کی (بجز چند کے) ایک جامع مسجد موجود ہے، اور بڑی شوکت و شان کی ہے،

ان میں سے جامع فاتح، جامع سلیمان، جامع بایزید، جامع والدۂ سلطان، جامع سلطان احمد، جامع ایاصوفیہ زیادہ ممتاز ہیں، اور ان سب میں جامع ایاصوفیہ اور بھی زیادہ عالیشان اور پُرشوکت ہے، ان مسجدوں کی وضع ہمارے یہاں کی مساجد سے بالکل الگ ہے، نہ دالان نہ محرابیں، نہ صحن، صرف ایک گنبد ہوتا ہے لیکن اس قدر وسیع کہ کئی ہزار آدمی اس میں آسکتے ہیں، اگرچہ ہندوستان کے مذاق کے لحاظ سے ان مسجدوں کو خوبصورت اور موزوں نہیں کہہ سکتے، تاہم گنبد کی بے انتہا وسعت اور عمارت کا ارتفاع انسان کو دفعۃً متحیر بلکہ مرعوب اور حیرت زدہ کر دیتا ہے، ہر مسجد میں کئی کئی سو بتیوں کے آہنی جھاڑ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جھاڑ کا رواج بہت قدیم زمانہ سے ہے، اسپین کی عربی تاریخوں میں ثریا کے لفظ سے غالباً اسی قسم کے جھاڑ مراد ہیں، البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں شیشے اور بلور کے ہوتے تھے، یہاں لوہے کے ہیں، عموماً تمام مساجد میں ایک خاص التزام ہے، اور اس سے قیاس ہوتا ہے کہ سلاطینِ ترک کو مذہبِ تسنن میں نہایت غلو تھا، اور بات بات میں اس کا اظہار کرتے تھے، عموماً ہر مسجد میں چار بڑی بڑی ڈھالیں چاروں کونوں پر ہوتی ہیں، اور ان پر آب زر سے نہایت خوشخط اور جلی حرفوں میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ لکھا ہوتا ہے، بالکل اس طرح جس طرح زیب و آرائش کے لئے دیواروں پر استادوں کے لکھے ہوئے قطعے لٹکاتے ہیں،

تمام مسجدیں پرتکلف اور آراستہ ہیں، معمولاً چٹائی اور جمعہ و عیدین کو عمدہ اور بیش قیمت قالین کا فرش بچھتا ہے، مسجد کے ایک طرف کچھ زمین چھوٹی ہوتی ہے، جس میں وضو کرنے کے لئے سقادہ بنا ہوتا ہے، میں نے اس بات کو

نہایت پسند کیا کہ یہاں حوض کا مطلق رواج نہیں،

جامع ایاصوفیہ

جامع ایاصوفیہ جو سب سے زیادہ عالیشان ہی اور تمام مسجدیں، اسی کے نمونہ پر بنی ہیں، دراصل ایک بہت بڑا گرجا تھا، جس کو قسطنطین نے ۳۲۵ء میں تعمیر کیا تھا، سات برس تک اس کی تعمیر جاری رہی، اور ۱۰۰ معمار اور دس ہزار مزدور کام کرتے تھے محمد فاتح نے کسی قدر تغیر کر کے اس کو مسجد بنا لیا، ابن بطوطہ نے اس کو گرجا ہونے کی حالت میں دیکھا تھا، وہ لکھتا ہے کہ "یہ رومیوں کا سب سے بڑا گرجا ہے اور چونکہ کوئی غیر شخص اس کے اندر نہیں جا سکتا، اس لئے میں اندر کی کیفیت نہیں بیان کر سکتا، باہر سے اُس کی یہ صورت ہے کہ ایک میل کا احاطہ ہے، اور تمام زمین میں رخام کا فرش ہے، بیچ میں ایک نہر ہے جس کے دونوں کنارے پر ایک ہاتھ بلند رخام کی دیوار ہے، اس دیوار میں عمدہ پچی کاری کا کام ہے، اور نہایت عمدہ بیل بوٹے بنے ہیں، گرجے کا دروازہ چاندی اور سونے کے پتروں سے منڈھا ہوا ہے، لوگوں کے بیان سے ظاہر ہوا کہ کئی ہزار پادری اور رہبان اس گرجے میں دن رات رہتے ہیں۔"

ابن بطوطہ نے جو صورت بیان کی افسوس وہ اب باقی نہیں رہی، احاطہ جسمیں نہر تھی مسجد سے بالکل باہر ہے، اور قہوہ خانہ بن گیا ہے،

واقعی یہ عمارت عجیب وغریب اور حیرت افزا ہے، بیچ کے گنبد کا قطر ۱۱۵ فٹ اور چھت کا ارتفاع ۱۸۰ فٹ ہے، ۱۰۷ استون ہیں اور کل سنگ سماق اور رخام کے ہیں، ان ستونوں کا قطر تین تین چار چار ہاتھ سے کم نہیں، دروازہ جو قسطنطین کے زمانہ کا ہے، اور تانبے کا ہے، اس پر قدیم زمانے کی تصویریں بنی ہیں،

اور اب تک قائم ہیں، چھت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کی جو تصویریں تھیں، ان کے آثار اب بھی موجود ہیں،

قابل دید مقامات بہت ہیں، مثلاً یونانیوں کے معابد قدیم، سلح خانہ، خزانہ یعنی جہاں تمام سلاطین عثمانیہ کی پورے قد کی تصویریں مع اصلی لباس و اسلحہ و جواہرات کے ہیں، توپوں کے ڈھالنے کا کارخانہ، موزہ خانہ یعنی عجائب خانہ قدیم جہاں نہایت قدیم زمانہ کے پتھر اور کتبے ہیں، اس میں سکندر یونانی کا سنگی تابوت بھی ہے، وغیرہ وغیرہ لیکن میں اکثر مقامات کو نہ دیکھ سکا، اس لئے انہی پر اکتفا کرتا ہوں جس کی خود میں نے سیر کی،

ترس خانہ یعنی جہازوں کے بنانے کا کارخانہ بہت بڑا عظیم الشان کارخانہ ہے، اور چونکہ حربی صیغہ سے متعلق ہے، محکمۂ بحریہ کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی شخص وہاں جا نہیں سکتا، خوش قسمتی سے محکمہ بحریہ کے ایک معزز عہدہ دار ہمارے دوست شیخ علی ظبیان کے شناسا تھے، اُنھوں نے مہربانی سے ایک عہدہ دار کو ساتھ کر دیا، جس نے ہم کو تمام کارخانہ کی بخوبی سیر کرائی، یہ صاحب عربی خوب سمجھتے اور بولتے تھے، اور اس وجہ سے ہم ہر ایک بات کو تفصیلاً دریافت کر سکتے تھے، یہ کارخانہ مختلف حصوں میں منقسم ہے، جس کا صدر مقام ایک بہت بڑی مستطیل دو منزلہ عمارت ہے، جہاں متعدد بڑے بڑے انجن ہیں، اور اُن کے ذریعہ سے سیکڑوں کلیں چلتی ہیں، ہمارے رہنما نے اول ہم کو اوپر کے درجہ کی سیر کرائی، پہلے ایک بڑے کمرے میں لے گئے، وہاں چند معزز افسر ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہوئے، ایک جہاز کا نقشہ تیار کر رہے

تھے نقشہ جب تیار ہو جاتا ہے، تو دوسرے آفس میں بھیجدیا جاتا ہے، جہاں اس
نقشے کے موافق جہاز کا مختصر سا نمونہ تیار کیا جاتا ہے، یہ نمونہ لکڑی کا ہوتا ہے، اور
باوجود مختصر ہونے کے جہاز کی پوری تصویر ہوتا ہے، یہ نمونہ اول سلطان کے ملاحظہ میں
پیش ہوتا ہے، اور منظوری کے بعد اسی کے نمونے کے موافق جہاز تیار کیا جاتا ہے
ان نقلی جہازوں کے دقائق اور نکتے تو میں کیا سمجھ سکتا تھا، لیکن بظاہر نہایت دقتِ
نظر اور استادی کا کام معلوم ہوتا تھا،

ان چیزوں کو دیکھکر ہم نیچے اُترے، یہاں سیکڑوں کلیں چل رہی تھیں اور
جدا جدا کام ہو رہے تھے، ایک طرف پرزے ڈھل رہے تھے، ایک طرف لوہے
کی موٹی موٹی سلاخوں پر سیکڑوں من کا گھن پڑتا تھا، اور چادریں بنتی جاتی تھیں،
اس عمارت کے آگے ایک بہت بڑا لمبا احاطہ ہے، وہاں ایک جہاز تھا جو بالکل
تیاری کے قریب تھا، صرف چادر چڑھانی باقی تھی، ہم نے یہاں تارپیڈو کی بہت سی
کشتیاں دیکھیں، جو اسی کارخانہ سے تیار ہوئی تھیں، اور سمندر میں ڈالی گئی تھیں،

تارپیڈو کی کشتیاں

ان جہازوں میں اوپر کے درجے میں کوئی چیز نہیں ہوتی، سارا جہاز لکڑی کا ایک
وسیع تختہ نظر آتا ہے، آلاتِ حرب اور ہر قسم کی ضروری چیزیں یعنی باورچیخانہ،
خوابگاہ، کھانے کا کمرہ غرض جو کچھ ہوتا ہے وہ اندر ہوتا ہے، ہمارے رہنما نے ہمکو ایک کشتی
کی سیر بھی کرائی، لیکن چونکہ اندر جگہ بہت کم ہوتی ہے، تھوڑی دیر میں ہمارا دم
گھٹنے لگا، اور ہم جلد باہر نکل آئے، نہایت قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اتنا بڑا
عظیم الشان کارخانہ صرف ترک چلاتے ہیں، تمام افسر اور کاریگر اور ملازم ترک
ہیں، صرف ایک یورپین معمولی درجہ کا ملازم ہے، اور وہ بھی قدامت کے لحاظ

سے بحال رکھا گیا ہے، انجن بھی یہاں تیار ہوتے ہیں، اور ترکوں کا بیان ہے کہ یورپ کے بنے ہوئے انجنوں سے کسی بات میں کم نہیں ہوتے، ایک افسر نے مجھ سے کہا کہ اس قسم کے تمام کاموں میں ہم کو یورپ کی احتیاج نہیں رہی،

مقتولان ینگ چری ترکوں کی تاریخ میں ینگ چری کا لفظ نہایت امپارٹنٹ لفظ ہے، سلطان آرخاں نے جو سلاطینِ ترک میں دوسرا تخت نشین تھا ۷۶۳ھ ہجری میں حکم دیا کہ اسیرانِ جنگ سے جو ہر سال کثرت سے گرفتار ہو کر آتے تھے ایک خاص تعداد منتخب ہو کر ایک فوج تیار ہو، حاجی بکتاش نے جو سلطان کا مرشد تھا، اس فوج کا نام ینگ چری رکھا جس کے معنی ترکی زبان میں فوج جدید کے ہیں فتوحات کی کثرت سے اس فوج کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ دو تین نسل کے بعد یہی فوج حکومت کی دست و بازو بن گئی، یہ عجیب بات ہے کہ یہ گرفتارانِ جنگ اگرچہ عموماً عیسائی نسل سے ہوتے تھے، اور فوج میں داخل ہو کر بھی مدتوں اپنے قدیم مذہب پر قائم رہتے تھے، تاہم ترکی حکومت کے ساتھ ان کو یہ اخلاص تھا کہ خود ترکوں کو اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا، ترکوں نے جو ایک مدت تک یورپ کو اپنا صید گاہ بنا رکھا تھا وہ انہی جانبازوں کی بدولت تھا ۱۸۲۶ء میں جب سلطان المحمود نے یورپ کے اصول پر فوج کو مرتب کرنا چاہا، تو ان لوگوں نے بغاوت کی، سلطان نے ایک جدید فوج پہلے سے تیار کر رکھی تھی، اہل شہر نے بھی شاہی جدید فوج کا ساتھ دیا، غرض خاص قسطنطنیہ میں ایک سخت معرکہ ہوا ینگ چری فوج بالکل برباد ہو گئی، اس کے ساتھ شاہی فوج کو بھی سخت نقصان پہنچا، اور وزیر اعظم اور شیخ الاسلام جان سے مارے گئے،

یہ مکان اسی معرکہ کی عبرت انگیز یادگار ہے، وزیر اعظم، شیخ الاسلام اور ینگ چری فوج کے تمام بڑے بڑے نامور افسروں کی پورے قد کی مورتیں ہیں، سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی پُر رعب شکلیں، قدیم زمانہ کا لباس اور اسلحۂ حرب، سکوت اور خاموشی کا عالم، یہ تمام باتیں جمع ہو کر کچھ ایسا ہیبت انگیز سماں پیدا ہو گیا ہے کہ دن کو وہاں جاتے ڈر لگتا ہے، دو پہلوانوں کو میں نے دیکھا، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، سر پر خود، چہرہ پر جھلم، ہاتھوں میں آہنی دستانے، بدن میں زرہ اور چار آئینہ، ٹخنوں تک کے آہنی موزے غرض آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ کردی جوان ہیں، جو خاص پائگاہ کی خدمت پر مامور تھے، میرے تخمینہ میں ایک من لوہے سے کم بوجھ اُن کے بدن پر نہ تھا، تعجب ہے کہ اس قدر وزن کے ساتھ وہ لڑتے کیونکر تھے، افسروں کے لباس عجیب و غریب قسم کے ہیں بعض بعض کی پگڑیاں ہاتھ ہاتھ بھر اونچی ہیں، یہاں ہر وقت سرکاری پہرہ رہتا ہے، اور ٹکٹ حاصل کرنے کے بغیر کوئی شخص وہاں جا نہیں سکتا،

عجائب خانہ

موزہ خانہ یعنی عجائب خانہ | عجائب خانے دو ہیں، ایک سرکاری جہاں نہایت قدیم زمانے کے پتھر اور کتبے اور اس قسم کی یادگار چیزیں ہیں، سکندر یونانی کا سنگی تابوت بھی ہے، افسوس ہے کہ مجھ کو اس کی سیر کا اتفاق نہیں ہوا،

دوسرا کسی عیسائی سوداگر نے قائم کیا ہے، عمارت اور اور تمام چیزیں معمولی ہیں، جو کچھ سیر کے قابل ہے، وہ دنیا کے مختلف حصوں کے آدمیوں کی مورتیں ہیں، یہ مورتیں اس خوبی سے بنائی ہیں کہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہیں، ایک عورت دیکھی جس کے ہونٹ نہایت موٹے تھے، اور نیچے کے ہونٹ میں آر پار چھید کر کے لکڑی

کی گلی ڈالی تھی معلوم ہوا کہ یہ وہاں کا زیور ہے، پہلے تو مجھ کو نہایت تعجب ہوا پھر خیال آیا کہ ہمارے ملک میں ناک کان چھید کر نتھ اور بالیاں وغیرہ پہناتے ہیں، تو ہونٹوں نے کیا قصور کیا ہے کہ اس زینت سے محروم رکھے جائیں،

درد انگیز تماشا،

یہاں میں نے ایک عجیب درد انگیز تماشا دیکھا، جس کا اثر دیر تک میرے دل پہ رہا، ایک جداگانہ کمرے میں چند عورتیں ہیں جو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہیں، ایک شکنجہ میں دابی جا رہی ہے، ایک کی پیٹھ پر جلتے ہوئے لوہے کی پٹری رکھدی ہے کہ گردن سے لے کر کمر تک چار چار انگل کھال اتر گئی ہے، اسی طرح اوروں کو عجیب عجیب طریقے سے اذیت دی جا رہی ہے، یہ عورتیں صورت اور وضع و لباس سے دولت مند اور شریف معلوم ہوتی ہیں، اکثر کم سن اور خوبصورت و نازک اندام ہیں، سخت تعجب ہوتا تھا کہ کن ظالم ہاتھوں نے ان حسن کی دیبیوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرات کی ہو گی! دریافت سے معلوم ہوا کہ اسپین میں جب اسلامی حکومت برباد ہو کر عیسائیوں کی سلطنت قائم ہوئی تو عموماً مسلمان تبدیل مذہب پر مجبور کیے گئے، اور چونکہ اسلام کا اثر آسانی سے دلوں سے مٹ نہ سکتا تھا، ان کو انواع واقسام کی اذیتیں دی جاتی تھیں، اور بے کسی اور کمزوری کے لحاظ سے عورتوں پر زیادہ ظلم کیا جاتا تھا، یہ مظلوم عورتیں اسی عبرت انگیز واقعہ کی یادگار ہیں، اس وقت مجھ کو خیال ہوا کہ آہا! یہی عیسائی ہیں جو ہم کو طعنہ دیتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا!!!

میں یہ معمانہ سمجھا کہ عجائب خانہ کے بانی نے جو عیسائی ہے ان تصویروں کو کس غرض سے یہاں رکھا ہے، کیا وہ عیسائیوں کا پر فخر کارنامہ دکھانا چاہتا ہے؟

اور حکومت ترک جو اس سے تعرض نہیں کرتی تو کیا اپنی بے تعصبی کا ثبوت دینا چاہتی ہے؟ میں تو اس بات کو نہایت ناپسند کرتا ہوں کہ دنیا کی مختلف قوموں میں جو ناگوار واقعات کسی قدیم زمانہ میں پیش آئے، وہ دوبارہ منظرِ عام پر لائے جائیں،

سیر گاہیں

قسطنطنیہ اور اس کے اطراف و جوار میں کثرت سے عجیب پُر لطف قدرتی سیر گاہیں ہیں، اور غنیمت یہ ہے کہ شہر والے اس نعمت کے قدر شناس بھی ہیں، سیر گاہ کے لئے ایک خاص دن مقرر ہے، اُس دن وہاں عجیب پُر لطف مجمع ہوتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ملک والے قدرتی مناظر کے مذاق سے آشنا نہیں، ورنہ خاص اُن سیر گاہوں کے دیکھنے اور ان سے مزہ اُٹھانے کے لئے لوگ قسطنطنیہ کا سفر کرتے، اور کوئی عجیب بات نہ خیال کی جاتی، ان میں سے میں نے دو تین کی سیر کی اور ان کے مختصر حالات لکھتا ہوں،

خونکر صوئی

خونکر صوئی قسطنطنیہ کی تمام سیر گاہوں میں سب سے زیادہ پُر لطف اور دلفریب ہے، اسی بنا پر اس کو سلطان المعظم کے نام سے منسوب کیا ہے خونکر فارسی لفظ خونگر کی تحریف ہے، ترکی میں خون کا مالک یا خون ریز بادشاہِ وقت کو کہتے ہیں، اور صوئی کے معنی پانی اور چشمہ کے ہیں، اس بنا پر خونکر صوئی کا ترجمہ "شاہی چشمہ" ہے، یہ مقام شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر ہے، پہاڑوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے، اور نہایت شاداب اور سرسبز ہے، اس میں ایک قطعہ نہایت موزوں نکل آیا ہے جو پہاڑ کی بلند سطح پر واقع ہے، خاص جس جگہ تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے،

وہ نہایت پُر لطف مقام ہے، سایہ دار درختوں کی دو رویہ قطاریں ہیں، جہاں تک نظر کام کرتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، ایک طرف آبشار ہے، جس کا پانی ایک حوض میں جمع ہوتا جاتا ہے، درختوں کے نیچے جابجا دو دو چار چار آدمیوں کی ٹکڑیاں ہوتی ہیں، چائے اور قہوہ کا دور چلتا ہے، حوض پر باجا بجتا ہے، اور فرنچ اور ترکی گانا ہوتا ہے، بھانڈ نقلیں کرتے ہیں،

پانچ چھ زینے چڑھ کر پہاڑ کی اصلی چوٹی ہے، اور وہ نہایت مسطح اور سایہ دار ہے، یہ خاص عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے، اور کثرت سے ٹرکش لیڈیاں جمع رہتی ہیں، نازک اندام عورتوں کے لئے بیس بیس میل کی مسافت، پہاڑ کی چڑھائی، گھوڑے یا خچر کی سواری کچھ کم تکلیف کی بات نہیں، لیکن یہ جگہ کچھ ایسی دلآویز ہے کہ سب تکلیفیں اس کے لئے گوارا کی جاسکتی ہیں،

مقر کوئی یہ ایک قہوہ خانہ ہے جو سمندر کے کنارے پر ہے، اور نہایت پُر فضا مقام ہے، موجیں بار بار کرارے سے آکر ٹکراتی ہیں، اور عجب مزہ آتا ہے، یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ چھ سات یہودی عورتیں ایک بلند چبوترہ پر بیٹھ کر عربی گیت گاتی ہیں، چونکہ ہم نے اس سے پہلے عربی راگ نہیں سنا تھا، مجھ پر ایک خاص اثر ہوا سب مل کر ساتھ گاتی تھیں اور دف کی قسم کا ایک باجہ بجاتی جاتی تھیں،

مُحرّم

یہاں کا محرم بھی ایک قابلِ ذکر چیز ہے، اہلِ عجم جو مختلف تعلقات کی وجہ سے یہاں بود و باش رکھتے ہیں، ان کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہیں ہے، بہت سے

سرکاری محکموں میں ملازم ہیں، بہت سے تاجر پیشہ ور اور مزدور ہیں، اگرچہ یہ لوگ شہر
کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، لیکن کثرت سے جہاں رہتے ہیں، وہ والدہ خانہ
نام ایک محلہ ہے، محرم کے زمانہ میں دھوم دھام کی مجلسیں اور نوحہ و بُکا کا ہنگامہ زیادہ
تر یہیں ہوتا ہے، مجلسوں میں یہاں سوز اور تحت اللفظ کا دستور نہیں، صرف حدیث خوانی
ہوتی ہے، اور درحقیقت مجلس عزا کا دستور بھی یہی ہے، عام طریقہ یہاں کا یہ ہے، کہ
اوّل منبر کے قریب ایک شخص کھڑے ہو کر زبانی جناب امیرؓ اور حضرت امام حسین علیہ السلام
کے فضائل و مناقب کے متعلق اشعار پڑھتا ہے، پھر ایک مستعد عالم منبر پر بیٹھ کر
حالاتِ کربلا کو وعظ کے طور پر نہایت خوبی اور صفائی سے بیان کرتا ہے، مجھ کو
اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ ترک عموماً ان محفلوں میں ادب اور خلوص کے
ساتھ شریک ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ترکوں کے لحاظ سے بجز ایک دو موقع کے
تمام مجلسوں میں وعظ جو ہوتا ہے ترکی ہی زبان میں ہوتا ہے،

ماتم کے چند طریقے ہیں، اور بعض نہایت عجیب اور موثر ہیں، ادنیٰ درجہ کا ماتم
یہ ہے کہ نہایت زور سے چھاتی پیٹتے ہیں، یہاں تک کہ اس جگہ کا گوشت اُبھر آتا
ہے، دوسرا طریقہ زنجیروں سے ماتم کرنا ہے، تیس تیس چالیس چالیس آدمیوں کا
حلقہ ہوتا ہے، اور سینہ یا پشت پر اس زور سے زنجیریں مارتے ہیں کہ دور تک
آواز جاتی ہے، تیسرا طریقہ تلواروں سے ماتم کرنے کا ہے، اور وہ شب شہادت
کے ساتھ مخصوص ہے، ماتم کرنے والے ہاتھوں میں تلواریں لئے صف باندھ کر
کھڑے ہوتے ہیں، اور عجیب جوش و خود رفتگی کے عالم میں یا حسین کہتے جاتے
اور سر و پیشانی اور شانوں پر تلواریں مارتے جاتے ہیں، زخموں سے خون

کی چھینٹیں اڑ اڑ کر تمام بدن پر پڑتی ہیں، اور حلقۂ ماتم گویا لڑائی کا میدان بن جاتا ہے، اس عبرت انگیز ہنگامہ کے دیکھنے کے لئے خلقت کا نہایت ازدحام ہوتا ہے، اور مشکل سے وہاں تک رسائی ہوتی ہے،

سلاملق یا موکب سلطانی او عید الضحیٰ

قسطنطینہ میں سلاملق سے زیادہ کوئی چیز پُر اثر اور دلچسپ نہیں ہے، سلاملق ترکی لفظ ہے جس کا لفظی ترجمہ سلام کرنا ہے، چونکہ اس موقع پر فوج اور سرداران فوج سلطان کے سلام کو آتے ہیں، اس لئے اس رسم کو سلاملق سے تعبیر کیا جاتا ہے، سلطان عام طور پر قصر شاہی سے باہر نہیں نکلتے، صرف نماز جمعہ پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں تشریف لاتے ہیں، اور وہیں نماز کے بعد یہ رسم ادا ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جو شان و شوکت اور عظمت و جلال ظاہر ہوتا ہے، زبان یا قلم کے ذریعہ سے اس کی تصویر کھینچنی مشکل اور سخت مشکل ہے، باوجودیکہ مہینے میں چار بار، اور سال میں اڑتالیس دفعہ یہ موقع پیش آتا ہے اور اس وجہ سے اس کو ایک معمولی چیز خیال کیا جا سکتا ہے، تاہم ہمیشہ تماشائیوں کا یہ ہجوم ہوتا ہے کہ لوگ درختوں اور آدمیوں کے کندھوں پر چڑھ کر تماشا دیکھتے ہیں، یورپ کے اکابر اور سیاح جو قسطنطنیہ کی سیر کو آتے ہیں، اس موقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، موکب ہمایونی کی گذرگاہ پر ایک بالاخانہ ہے، معزز لوگوں کو ٹکٹ لے کر وہاں بیٹھنے کی اجازت ملتی ہے، چنانچہ ہر جمعہ کو ان تماشائیوں کا ایک معتدبہ مجمع ہوتا رہتا ہے، میرے زمانہ اقامت میں ہنگری کے بڑے بڑے ارکانِ سلطنت قسطنطنیہ کی سیر

کو آئے تھے، اور اس مجمع میں شریک ہوئے تھے،

میں ہندوستان میں یہ حالات سُن چکا تھا، اس لئے قسطنطنیہ پہنچکر اول اسی کی سیر کا ارادہ کیا، ایک شامی عرب کو جن سے حال میں ملاقات ہوگئی تھی ساتھ لیا اور جامعہ حمیدیہ پہنچا، وہاں پہنچ کر دیکھا تو دور دور تک سپاہیوں کے پرے جمے ہیں، اور موکب ہمایونی تک نظر کی رسائی ہی مشکل ہے، مجبوراً واپس آیا، حسین حسیب آفندی جو کسی زمانہ میں بمبئی ٹرکش کانسل تھے، اور اب قسطنطنیہ میں پولس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربۂ روس میں میں نے بحیثیت سکرٹیری انجمن تین ہزار کی رقم انہی کے ذریعہ سے قسطنطنیہ کو روانہ کی تھی، اسی تعارف کی بنا پر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ نہایت مہربانی سے پیش آئے اور کہا کہ جمعہ کے دن جامع حمیدیہ میں آنا، تمھارے لئے میں ٹکٹ لے رکھوں گا، لیکن بدقسمتی سے (اور پوچھئے تو خوش قسمتی سے) جب میں وہاں پہنچا تو وہ موجود نہ تھے، دیر تک مسجد کے دروازے پر ان کا انتظار کرتا رہا، قریباً ایک بجے جب سلطان کی آمد آمد کا غل ہوا تو فوجیں دور دور تک پھیل کر ہلال کی شکل میں صف آرا ہوگئیں، اور تمام راستے رُک گئے، میں مایوس ہوکر مسجد میں داخل ہوا، اور افسوس کرتا تھا کہ یہ جمعہ بھی خالی گیا، تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک گرج کی سی آواز آئی، اور تمام میدان گونج اٹھا معلوم ہوا کہ سلطان کی سواری قریب آپہونچی، اور یہ "بادشاہم چوق یشا"[1] کا نعرہ تھا جو ترکوں کا قومی نعرہ ہے، یہ نعرے پے درپے تین بار بلند ہوئے، کوکب سلطانی مسجد تک آپہنچا، اور نعروں کی گونج ابھی تھم نہیں چکی تھی کہ موذن نے جو سلطان کے

[1] اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے "ہمارا بادشاہ بہت زندہ رہے"!

مشاہدۂ جمال کا انتظار کر رہا تھا، اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا، دونوں آوازیں مل کر دل پر عجیب اثر کرتی تھیں، سلطان کھلی ہوئی گاڑی پر سوار تھے، چونکہ مسجد کا صحن داخلِ مسجد نہیں، یعنی وہاں نماز نہیں پڑھتے اور جوتے پہن کر جا سکتے ہیں، گاڑی صحن تک آئی اور دیوار کے قریب آکر ٹھہری، مسجد دو منزلہ ہے، اور اوپر کی مسجد میں گیلری بنی ہے جو خاص سلطان کی نماز پڑھنے کی جگہ ہے، سلطان گاڑی سے اتر کر اوپر کی منزل میں گئے، اور ان کے جانے کے ساتھ گیلری کے دریچوں پر اطلسی پردے چھوڑ دیئے گئے، کہ ان پر کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے،

لوگ اطمینان کے ساتھ بیٹھ چکے تو خطیب نے خطبہ شروع کیا، افسوس ہے کہ خطیب ترک تھا، عرب نہ تھا، اس لئے اُس کے لہجہ میں وہ اثر اور کیفیت نہ تھی جو عرب کے ساتھ مخصوص ہے، تاہم دوسرا خطبہ شروع ہوا، اور اس نے سلطان المعظم کی طرف اشارہ کر کے پُرجوش آواز میں یہ الفاظ پڑھے، اللھم انصر ھذا السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان السلطان عبد الحمید خان، تو عجیب کیفیت پیدا ہوئی میرا یہ حال تھا کہ آنکھ سے متصل آنسو جاری تھے، اور دیر تک زبان سے دعائیہ الفاظ نکلتے رہے عین اس موقع پر ایک بارگی پندرہ بیس شخص جن کے ہاتھوں میں عرض حال اور درخواستیں تھیں اٹھ کھڑے ہوئے، یہ لوگ سلطان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیتے جاتے تھے، اور عرضیاں پیش کرتے جاتے تھے، عرض بیگی ان کاغذوں کو لیکر جمع کرتا جاتا تھا، بعضوں کو میں نے دیکھا کہ سلطان کی طرف اشارہ کر کے زمین تک جھکے اور زمین کو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو چوما، اگرچہ یہ تمام باتیں خطبہ کے آداب اور سکون کے خلاف تھیں، تاہم کیفیت سے خالی نہ تھیں، دریافت سے معلوم ہوا، کہ جن لوگوں کو کسی طرح سلطان المعظم تک رسائی کا امکان نہیں ہوتا، وہ اس ذریعہ سے اظہارِ مطلب کرتے ہیں، اور چونکہ سلطان

کا مزاج قدرتی طور پر رحیمانہ اور فیاض ہے، اس طریقہ کو بند نہیں کیا جاتا،
نماز کے بعد اتفاق سے حسین حسیب آفندی ملے اور شکایت کی کہ میں تم کو ڈھونڈھتا پھرتا تھا، تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ بالاخانہ کا ٹکٹ تو اب نہیں مل سکتا لیکن میں تمھارے لئے اس سے زیادہ عمدہ موقع نکالتا ہوں، نماز پڑھ کر تمام لوگ باہر چلے گئے. تو سلطان گیلری سے اُترے اور ایک زینہ پر جہاں سے سلاملق کی بخوبی سیر ہو سکتی تھی اور سلطان کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا تھا، آکر ٹھہرے، افسرانِ فوج اور پاشا صحن کے داہنی طرف صف باندھ کر کھڑے ہوئے، حسین حسیب نے مجھ کو اسی صف میں لاکر کھڑا کر دیا، اور لوگوں سے کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، ایک معزز افسر (حسنِ اخلاق کی وجہ سے) پیچھے ہٹ گیا اور میرے لئے جگہ خالی کر دی،

تھوڑی دیر کے بعد فوجوں کی آمد شروع ہوئی، ایوانِ شاہی سے مسجد تک وسیع اور ڈھلوان سڑک ہے، فوجیں جو دور دور تک ہلال کی صورت میں صف آرا کھڑی تھیں ایوانِ شاہی کے سامنے سے گذرتی ہوئی مسجد کے صدر دروازے سے داخل ہوتی تھیں، اور دوسرے دروازہ سے نکل جاتی تھیں، صفوں کی ترتیب، سوار، پیادہ، بحری، بّری، توپچی، برق انداز، ترک، کُرد، عرب کے جدا جدا دستے، موزوں اور باقاعدہ رفتار، زرق برق اسلحے، مختلف اور خوشنما وضع کی وردیاں، فوجوں کا پے در پے آنا اور وفادارانہ جوش کے ساتھ اپنے شاہنشاہ کے سامنے سے گذرنا، ایسا عجیب و غریب سماں تھا، جو کسی طرح بیان نہیں ہو سکتا، عربوں کا رسالہ جو امپیریل گارڈ

ہے، ان کے سروں پر عمامے تھے، سبز شملے ہوا میں اُڑ کر عجیب لطف دکھاتے تھے
متصل تین گھنٹے تک یہ فوجی دریا لہریں لیتا رہا، اور کم و بیش دس ہزار فوجیں
گذریں، اخیر میں سلطان کے دونوں شہزادے آئے اور عجیب شان سے آئے،
فوجی لباس تھا، اور کمر سے تلواریں بندھی تھیں، اگرچہ دس دس بارہ بارہ
برس کا سن تھا، لیکن جس انداز سے وہ گھوڑوں پر سوار تھے، اور اُن کے
چہروں سے جس جرأت اور شان کا اظہار ہوتا تھا بیان میں نہیں آ سکتا، شہزادے
بھی جا چکے تو سلطان زینہ سے اُترے اور افسرانِ فوج اور پاشاؤں کی صفیں
جن میں میں بھی شامل تھا، دفعۃً سلام کو جھکیں، میں ابتدا سے محوِ حیرت تھا، اور
آنکھوں کو ٹکٹکی لگ گئی تھی، پہلے سے ارادہ تھا کہ سلطان کی زیارت ہو گی تو نہایت
نیازمندی کے ساتھ آداب بجا لاؤں گا، لیکن از خود رفتگی کا یہ عالم ہوا کہ
تمام صف کی صف دیر تک رکوع میں رہی اور میں اسی طرح ٹکٹکی باندھے
کھڑا رہا، البتہ زبان پر دعائیہ الفاظ جاری تھے اور وہ بھی قصداً نہیں بلکہ
ایک بے اختیاری حالت تھی،

پانچ چار قدم پیادہ چل کر سلطان گاڑی پر سوار ہوئے، افسروں نے
دوبارہ سلامی دی اور وہ عجیب و غریب سماں دفعۃً آنکھوں سے چھپ گیا، ع

دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

سلطان جس وقت زینے سے اتر کر گاڑی کی طرف بڑھے، ہماری صف
سے ان تک صرف تین چار ہاتھ کا فاصلہ تھا، اور اس وجہ سے میں اچھی طرح
ان کو دیکھ سکا، سلطان کا حلیہ یہ ہے، قد میانہ بلکہ کچھ نکلتا ہوا، بدن

چھریرہ، چہرہ کتابی، صورت سے وقار اور متانت ٹپکتی ہے، بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی فکر میں ہیں، لباس بالکل سادہ، یعنی سیاہ بانات کا کوٹ اور معمولی ٹرکش ٹوپی تھی،

سلاملق کی رسم

ترکوں میں سلاملق کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے، اور رسوم سلطنت کا ایک جزو بن گیا ہے، اس سے فقط شاہانہ جاہ و جلال کا اظہار مقصود نہیں ہے بلکہ بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں فوج کے ایک بڑے حصہ کا جائزہ ہو جاتا ہے، اور اس طرح کل فوجیں جو پایہ تخت اور اس کے اطراف میں رہتی ہیں، سال میں چند بار ملاحظہ سلطانی سے گذر جاتی ہیں، سلطانِ وقت فوج کی حالت کا کافی اندازہ کر سکتا ہے، اور فوج کے دل میں بادشاہ کی طرف سے جوش اور وفاداری کے خیالات تازہ ہو جاتے ہیں،

یہ تماشا دیکھ کر قیام گاہ پر واپس آیا، تو دل جوش اور اثر سے معمور تھا، شاعرانہ جذبات کی تحریک سے خود بخود جستہ جستہ مصرعے زبان پر آتے جاتے تھے قلم و کاغذ لیکر بیٹھا اور کچھ اشعار قلمبند کئے، پھر خیال آیا، کہ عید کے دن اس سے بھی بڑھکر سامان ہوگا، اس کو دیکھ لوں تو لکھوں، چنانچہ تمہید کے جس قدر اشعار اس وقت تک موزوں ہو گئے تھے، لکھ کر چھوڑ دیئے، تمہید کے آخر کے ان اشعار سے،

دیں کہ بپرسید کہ زاں جلوہ گاہ تا چہ بود حاصلِ چشم و نگاہ

اس شعر تک

بزم چو از جلوۂ زیبا پُر است دامنِ چشمم ز تماشا پُر است

یہی پُراثر اور پُرجوش نظارہ مراد ہے،
عید کے دن سلاملق نہ تھی اور اس وجہ سے فوج کی تعداد کم تھی، لیکن شان و شوکت، جاہ و جلال، جوش و اثر سلاملق سے بھی کچھ بڑھ کر تھا، قریبًا آٹھ بجے فوجوں کی آمد شروع ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک تانتا بندھا رہا، اس کے بعد بہت سی خالی گاڑیاں آئیں، لوگوں کو تعجب تھا کہ ان سے کیا مقصد ہے، یکایک دور سے پیادہ صفیں نمودار ہوئیں معلوم ہوا کہ تمام وزرار، پاشا، افسرانِ فوج اور بڑے بڑے عہدہ داران ملکی سلطان کے جلو میں پیادہ پا آرہے ہیں، یہ صفیں سڑک کے دونوں جانب متصل آدھ میل تک تھیں، اور ان کی وضع اور لباس سے عجیب شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، شانوں پر زرّیں پھول، دامن اور آستینوں پر کلابتوں کی تحریر، سینے مرصع اور طلائی تمغوں سے ڈھکے ہوئے، ان سب پر آفتاب کا عکس، تمام میدان جگمگا اُٹھا تھا، یہ صف جاچکی تو سلطان کا جمالِ جہاں آرا نظر آیا، جنابِ ممدوح گھوڑے پر سوار تھے، لباس بالکل سادہ تھا، چند بڑے بڑے نامور فوجی افسر رکاب میں تھے، گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا تھا، اور ہر قدم پر اس زور سے پادشاہم چوق یشا کا نعرہ بلند ہوتا تھا، کہ تمام میدان گونج اٹھتا تھا،
میں یہ سماں دیکھ کر واپس آیا، تو قلم دوات لے کر بیٹھا کہ جو کچھ خود دیکھا ہے، دوسروں کو بھی دکھا سکوں، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ قلم نے بالکل کوتاہی کی، جو تصویر میں نے کھینچی ہے، وہ بالکل نامکمل تصویر ہے،

مثنوی عیدیہ

جون ۱۸۹۲ء

(مقام قسطنطنیہ)

قاصدِ فرخندہ من ہاں تعال
متّعکَ اللّٰہ بحسن المآل

پیش رسیدت سفرے ناگزیر
گرم ز جا خیز و رہِ ہند گیر

زودرو و فکرِ دو عالم مکن
در نفسے راست کنی ہم مکن

دیدہ براہ اند عزیزانِ ہند
جملہ گرامی گہر کانِ ہند

چوں تو دراں بزم کشی زمزمہ
دائرہ گردند بگردت ہمہ

تا ز حدیثِ تو شود بہرہ مند
ہر یکے از جائے جہد چوں سپند

جملہ بدیں حرف کہ ای نیکخوے
حرفی ازاں یار سفر کردہ گوے

تا بچہ حال است و چساں ست خود
رفت چہا بر سرش از نیک و بد

بر روشِ دیدہ وراں میزید
یا کہ چو بہمان و فلاں میزید

از پسِ ایں محنت و رنجِ شگرف
از سفرِ روم چہ برداشت طرف

بزمِ خوشی بود تماشا چہ کرد
کار بسے بود از آنہا چہ کرد

در صفِ دانش طلباں چوں نشست
زاں چمنِ تازہ بدامن چہ بست

طے چو شود مرحلۂ پرس و جوے
از منِ آوارہ بیاراں بگوے

کاے ہمہ گنجینہ کشایانِ فن | صدر نشینانِ سرِ خوانِ فن

از کرمِ داورِ بالا و پست | حالِ من آں گونہ کہ بایست ہست

ہم بہماں طرز و روش میزیم | زندہ ام و فارغ و خوش میزیم

گرچہ خودم با سر و ساماں نیم | نازکشِ حاجب و درباں نیم

نیست سرِ انجمن آراے، | ایں منم و گوشۂ تنہائیے

ونیکہ بپرسید کہ زاں جلوہ گاہ | تا چہ بود حاصلِ چشم و نگاہ

ہی چہ تواں گفت کہ ذوقِ سخن | ہر نفسم مے برد از خویشتن

گرچہ نخواہم کہ نشینم خموش | فرصت آں کو کہ بیایم بہوش

گرچہ بعرضِ سخن آمادہ ام، | مست ز کیفیتِ ایں بادہ ام

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس | خواب خوشے دیدم و دیگر مپرس

خوانِ سخن گر نہ خود آراستم | عذر بنہ محوِ تماشاستم

تندمے بود خرابم ہنوز | دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز

با تو چہ گویم کہ چہا دیدہ ام | شعبدہ ہا پیشِ نظر چیدہ ام

بزم چو از جلوۂ زیبا پُر است،

دامنِ چشم ز تماشا پُر است

مہر چو از جیبِ افق سر کشید | خاست ز ہر ناحیہ گلبانگِ عید

دیدہ پُر از خواب چو برخاستند | پیر و جواں جملہ تن آراستند

طفل کہ ایں شیوہ ندانند درست | مادرش از مہر تن و روے شست

شیوہ و آئینِ طرب تازہ گشت | کوچہ و بازار پُر آوازہ گشت

مژدہ رسید ایں کہ شہِ چارہ ساز   زود برآید بادا ے نماز،

تا بردا ز خوانِ کرم توشۂ   خلق بردن ریخت ز ہر گوشۂ

بسکہ عناں طلب انگیختند   طفل و جواں بر سرِ ہم ریختند

پیکِ نظر راہِ تماشا نیافت   نقشِ قدم ہم بہ زمیں جا نیافت

جملہ بصد شوق و بصد آرزوی   سوے نشنگطاش نہادند روی

سرمۂ خاکِ رہِ شہ خواستند   جا بگذرگاہِ سپہ خواستند

از دو سوے راہ بکسب شرف   خلق بآئینِ ادب بست صف

مہر چو در ہر جہت افشاند نور   کوکبۂ شاہ عیاں شد ز دور

گشت رواں از پیِ ہم خیل و فوج   موج تو گوئی کہ شکستی بموج

بود شعارِ ہمہ از ہم جدا   ہر ہمہ را رایت و پرچم جُدا

پرتوِ آں اسلحہ تابناک   نور ہمی ریخت بدامانِ خاک

با ہمہ تمکین چو گذشت ایں گروہ   گشت بہ یکبار زمین پُر شکوہ

غلغلہ برخاست کہ بادا نوید   مہرِ جہانتابِ خلافت دمید

داغ نہ جبہۂ خورشید و ماہ   حضرتِ خاقان خلافت پناہ

قاعدۂ دولت و دیں را مدار   آئینۂ رحمتِ پروردگار

پیکرِ لطف و کرمِ کبریاے   سایہ یزداں شہِ کشور کشاے

خسرو لشکر شکن و قلعہ گیر   شاہ فلک عتبہ و گردوں سریر

فاتحۂ دولت و طغراے دیں   زیب دہِ افسر و تاج و نگیں

شاہ فلک کوکبۂ عبد الحمید   ایدہ اللہ بنصر مزید

فرۂ شاہی ز جبیں آشکار   حاشیہ بوساں بہ یمین و یسار

مرکبِ شہ پیش چو بگذاشت پاے   خلق بہ یکبار در آمد ز جاے

طلعتِ شہ باز چو پرتو فگند   بانگِ دعا گشت ز ہر سو بلند

شور بر آمد کہ بود تا جہاں   باد بکامِ تو زمین و زماں

چرخ بداں مایہ کہ گردندہ است   زندہ بماں کز تو جہاں زندہ است

زیب و طرازِ ہمہ عالم توئی   سایہ یزداں بجہاں ہم توئی

جملہ بدانند کہ در غرب و شرق   ہست ترا تاجِ خلافت بفرق

آں توئی امروز کہ در روزگار   ہست برو دولت و دیں را قرار

تازگی بدر و حنین از تو ہست   زیب و طرازِ حرمین از تو ہست

جز تو کہ ہست ای شہِ انجم سپاہ   آنکہ بود شرعِ نبیؐ را پناہ

فرۂ دینِ نبویؐ از تو ہست   بازوی اسلام قوی از تو ہست

شرع بجاہ تو چو شد ارجمند   باد بفرمانِ تو چرخِ بلند

سکۂ اقبال بنامِ تو باد
ہر چہ بگیتی ست بکامِ تو باد

—•—

ترکوں کے اخلاق و عادات و طرز معاشرت

قسطنطنیہ میں میں اگرچہ متصل تین مہینہ رہا، لیکن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ترکوں سے میرا میل جول بہت کم تھا، میرے ہم صحبت اور میرے احباب جس قدر تھے شام کے عرب تھے، اس لئے ترکوں کے اخلاق و عادات کے متعلق میری واقفیت سرسری اور اجمالی ہے، میں نے اکثر کالج و اسکول اور بعض صنعت وغیرہ کے کارخانے دیکھے، چند معزز عہدہ داران ملکی سے ملا اور ان کے یہاں دعوتیں کھائیں، قہوہ خانوں میں کبھی کسی سے ملاقات ہو گئی، ٹراموے اور ریل پر کسی سے تعارف ہو گیا، غرض اس قسم کے مواقع تھے جس میں مجھ کو ترکوں کے اخلاق اور عادات کا تجربہ ہوا، اور اس باب میں میں جو کچھ لکھوں گا انہی واقعات کی بناء پر ہو گا،

ہرچند میری واقفیت کے ذریعے اس قدر محدود ہیں، تاہم بعض امور کی نسبت مجھ کو بالکل یقین ہے کہ اُن کے متعلق میری جو رائے قائم ہوئی ہے، وہ قطعاً صحیح ہے، اور اُس میں ذرا بھی غلطی کا احتمال نہیں، ان میں سب سے مقدم ترکوں کی مہمان پرستی اور عام خوش اخلاقی ہے، کچھ شبہہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں، غرور و نخوت، ترفع اور کم بینی ان مین نام کو نہیں ہے، امیر و غریب، مزدور و عہدہ دار، وضیع و شریف، جاہل و عالم ہر درجہ کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا، لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک

ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے، غازی عثمان پاشا جن کو پلونا کے واقعہ نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے، اور درویش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے، اس مرتبہ کے لوگ ہیں، جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف، میں دونوں سے ملا ہوں، اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے،

ایک عام بات یہ ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو، راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمھاری طرف متوجہ ہو گا، اور تم کو راستہ بتائے گا، بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گذرنے کا اتفاق ہوا، اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا، اتفاقًا کوئی ترک آنکلا تو اُس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ساتھ ہو لیا، اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہنچا کر واپس آیا،

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے، اور نہایت ادنی درجے کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں، یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہو گا، ایک شخص سب کی طرف سے دے دیگا، گو یا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں، اور وہ میزبان ہوتا ہے، خونکر صوی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، میں اس کی سیر کو گیا تو خوجی آفندی ساتھ تھے، چونکہ یہ مقام قسطنطنیہ سے بیس پچیس میل ہے، اور میرے ساتھ اور بھی چند احباب تھے جہاز اور گاڑی کا کرایہ اور تفنکہ وغیرہ میں عہ رخرچ ہوئے، یہ کل رقم خوجی آفندی

مہمان
ور
خلاقی

و مہمان
ی،

نے ادا کی، میرے شامی احباب کو جو خود مقتدر اور فیاض طبع تھے، آفندی موصوف کا زیر بار احسان ہونا گوارا نہ تھا، لیکن ملک کے رواج کی وجہ سے زیادہ اصرار نہ کر سکے،

ایک دفعہ میں درویش پاشا کے مکان پر گیا، وہاں چند اور بزرگ تشریف رکھتے تھے، سب سے تعارف ہوا، اور دیر تک صحبت رہی، چونکہ اس وقت تک میں نے ترکی بوٹ کا استعمال نہیں شروع کیا تھا، اور انگریزی بوٹ پہنکر مکان کے اندر جانا معیوب ہے، میں نے دروازے ہی پر بوٹ اتار دیا تھا، ترکوں کے نزدیک بوٹ کا پاؤں میں نہ ہونا بدسلیقگی میں داخل ہے، اس لئے کسی کسی کو خیال ہوا، حاضرین میں سے ایک بزرگ جو اسکول کے ماسٹر اور معزز آدمی تھے، چپکے سے اُٹھے اور ایک سلیپر لاکر میرے سامنے رکھدی، ان بزرگ کا نام کاظم آفندی تھا، نوجوان آدمی ہیں، ریاضی میں ان کی تصنیف حضور سلطانی میں پیش ہو چکی ہے، رخصت ہوتے وقت مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان پہنچکر یاد رکھئے گا کہ قسطنطنیہ میں کاظم بھی آپ کا ایک نیازمند تھا،

حسین حسیب آفندی جو پولس کمشنر اور معزز رتبے کے آدمی ہیں، ملاقات کے ساتھ اس لطف و مہربانی سے پیش آئے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، اصرار کرکے کھانا کھلایا، کوٹھی اور پائیں باغ کی سیر کرائی، پردہ کراکر زنانہ مکان کے تمام کمرے دکھائے، رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ مجھکو بھی کچہری جانا ہے، ساتھ ہی چلیں گے، چنانچہ اپنی گاڑی پر بٹھا کر دور تک ساتھ لائے، لطف یہ کہ اس وقت میرا ذریعۂ تعارف بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا

ہوں اور مسلمان ہوں، اس قسم کے واقعات سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ ترکوں کے اخلاق نہایت عام ہیں اور اس کے لئے وسیلہ و تعارف عزت و جاہ کی سفارش کی کچھ ضرورت نہیں،

ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابلِ تقلید ہے، امرا اور معزز عہدہ دار ایک طرف، معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے، ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں، میں نے دس ہزار کے تنخواہ دار سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں، اگرچہ دونوں کی حالتوں میں نہایت تفاوت تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا، تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر تھے،

ڈرائنگ روم کا قدیم طریقہ یہ تھا اور متوسط حیثیت والوں میں اب بھی جاری ہے کہ دیوار سے متصل قریباً دو ہاتھ چوڑے اور دیوار کے طول کے برابر لمبے چبوترے بنے ہوتے ہیں، اور ان پر گدا بچھا ہوتا ہے، اب اگرچہ میز و کرسی کا زیادہ رواج ہے، تاہم چونکہ معزز ترکوں کے ہاں علما اور درویشوں کی اکثر آمد و رفت رہتی ہے، ایک آدھ کمرہ اس طریقہ پر بھی ضرور مرتب رہتا ہے، میں نے عثمان پاشا اور درویش پاشا کے عالیشان مکانوں میں بھی اس وضع کے متعدد کمرے دیکھے، زمانۂ حال میں یورپ ہی کا طریقہ زیادہ مروج ہے، ترکوں نے اس میں اپنی طرف سے کچھ اصلاحیں کی ہیں، اور وہ در حقیقت قابلِ تعریف اصلاحیں ہیں، ڈرائنگ روم میں جو اکثر عمدہ ٹرکش قالین سے آراستہ ہوتا ہے، اس سرے سے اُس سرے تک سڑک کے طور پر کارپٹ وغیرہ

ترکوں کی معاشرت

ترکوں کی وضع و ترتیب

کی ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی پٹیاں بچھی ہوتی ہیں، کمرے میں جو لوگ آتے جاتے ہیں، اسی پر سے گذرتے ہیں، ادھر اودھر پاؤں نہیں رکھ سکتے، ترکوں کا بوٹ اگرچہ خاک آلودہ نہیں ہوتا، لیکن اس طریقہ سے فرش اور بھی صاف و پاک رہتا ہے۔

کھانے کا طریقہ

کھانا یوروپین طریقہ پر یعنی میز کرسی پر کھاتے ہیں، البتہ بعض باتوں میں فرق ہے، اور میری دانست میں وہ اصلاح طلب ہیں، عام دستور یہ ہے کہ جب تمام لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، تو نوکر آکر ہر شخص کے آگے سادہ رکابیاں چن دیتا ہے، اس کے بعد باری باری مختلف کھانوں کی رکابیاں آتی ہیں، اور میز کے بیچ میں رکھی جاتی ہیں، تمام لوگ ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں، چھری کانٹا بھی ہوتا ہے لیکن (اکثر) کھاتے ہاتھ سے ہیں، میں نے حسین حسیب آفندی پولس کمشنر اور درویش پاشا کے یہاں کھانا کھایا درویش پاشا کے بیٹے احمد پاشا جو سلطان المعظم کے سمدھی ہیں، میز پر ہمارے ساتھ تھے، اور اسی طریقہ سے کھاتے تھے، لوگوں نے بیان کیا کہ اب یہ طریقہ متروک ہوتا جاتا ہے، اور حال کے تعلیم یافتہ بالکل یوروپین طریقہ پر کھاتے ہیں،

مکانات کے دروازوں کا ہمیشہ بند رہنا

ہندوستان کے برخلاف عام دستور ہے کہ مکانات کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں، اندر ایک کھٹکہ ہوتا ہے جو دروازہ بند کرنے کے وقت خود بخود لگ جاتا ہے، باہر کی طرف ایک کڑا ہوتا ہے، کوئی شخص کسی سے ملنے کو جاتا ہے، تو کڑے سے دروازہ کو کھٹ کھٹاتا ہے، آواز سُنکر نوکر یا صاحب خانہ کواڑ کھول دیتا ہے، امرا کے یہاں دروازہ کے بیرونی رخ پر

پیتل کا پھول لگا ہوتا ہے، اس کے دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے، اور نوکر کو خبر ہو جاتی ہے، یہ طریقہ نہایت عام ہے، یہاں تک کہ غریب سے غریب آدمی کے دروازے بھی کھلے نہیں رہتے، اگرچہ دراصل سردی سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، لیکن اس سے طرزِ معاشرت میں خودبخود نہایت تہذیب و اصلاح پیدا ہو گئی ہے، ہر شخص لاتدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا کی تعمیل پر مجبور ہے،

ترکوں کا لباس جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں بالکل یورپین ہے، البتہ بوٹ میں ایک اختراع کی گئی ہے، اور وہ واقع میں قابلِ تعریف ہے، یہ بوٹ چرمی جرّاب اور سلیپر کا مجموعہ ہے، جراب بالکل بوٹ کی شکل کی ہوتی ہے، لیکن ایڑی نہیں ہوتی، سلیپر میں اندر ایڑی کے پاس ایک کھٹکا لگا ہوتا ہے، جراب پہنکر جب اس کو پہنتے ہیں تو جراب اس میں اٹک جاتی ہے، اور دونوں مل کر خاصہ بوٹ بن جاتا ہے، بازار میں دونوں پہنے پھرتے ہیں، لیکن فرش پر سلیپر اُتار دیتے ہیں، صرف جراب رہجاتی ہے، اور چونکہ وہ گرد سے پاک ہوتی ہے، فرش پر دھبہ تک نہیں پڑتا،

ملاقات کا طریقہ نہایت مہذب اور پسندیدہ ہے، تم کسی سے ملنے جاؤ اور دروازہ کھٹکھٹاؤ تو اسی وقت نوکر آکر دروازہ کھول دیگا، مکان میں اسی غرض سے ایک خاص کمرہ فرش فروش سے آراستہ رہتا ہے، نوکر تم کو وہاں بٹھا دیگا اور قہوہ یا چاے پیش کریگا، اس کے بعد صاحبِ خانہ کو اطلاع ہو گی وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھے گا اور تم کو وہیں بلائے گا، بڑے بڑے معزز افسروں کی ملاقات کا یہی طریقہ ہے، انگریزوں کی طرح احاطے کے باہر برانڈے میں ٹہلنا اور دیر

تک انتظار کرنا نہیں پڑتا،

سلام کرنے کا عجیب طریقہ ہے، پہلے سینہ پر، پھر ہونٹوں پر، پھر پیشانی پر، ہاتھ رکھتے ہیں، ان اعضار کا ہاتھ سے چھو لینا ضرور نہیں صرف محاذات کافی ہے، اگرچہ اس طریقہ پر سلام کرنے میں ہاتھ کو تین منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں لیکن مشاقی کی وجہ سے تینوں مرحلے اس جلدی سے طے ہوتے ہیں کہ معمولی سلام سے زیادہ عرصہ نہیں لگتا، اس ایجاد میں یہ فائدہ ہے کہ قد کو جھکانا نہیں پڑتا، اور ایشیائی تعظیم ادب بھی ہاتھ سے نہیں جاتا، مجلس میں سلام کرنے کا جو طریقہ ہے وہ زیادہ تکلف آمیز ہے، یعنی بیٹھ جانے کے بعد حاضرین میں سے ہر شخص کی طرف الگ الگ مخاطب ہو کر سلام کرنا پڑتا ہے، بالکل اس طرح جیسا لکھنؤ میں دستور ہے معلوم نہیں ترک جیسے سپاہیوں کو یہ لکھنوانہ تکلف کس نے سکھایا،

ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے، کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان و شوکت کا نام نہیں، بڑے بڑے وزرار، امرار بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں، میں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے، صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے ہیں، سپہ سالار کل علی رضا پاشا کے ساتھ پانچ سوار سے زیادہ نہیں ہوتے، مکانات اور تمام معاشرت کی چیزوں میں بھی سادگی پائی جاتی ہے، عثمان پاشا، درویش پاشا، زکی پاشا جس حیثیت اور رتبہ کے لوگ ہیں، اس لحاظ سے ان کے مکانات کو کم از کم حیدر آباد کا فلک نما اور بشیر باغ ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ ہمارے مولوی مہدی علی صاحب کی کوٹھی کے برابر بھی نہیں، نوکر چاکر بھی کثرت سے نہیں ہوتے،

جیسا ہمارے ہاں نواب اور فرضی شاہزادوں کے ہاں دستور ہے، حق یہ ہے کہ ترک اس بات پر جہاں تک فخر کریں بجا ہے، کہ اُنھوں نے چھ سو برس تک سلطنت کے سایہ میں پل کر سپاہیانہ پن نہیں چھوڑا، ورنہ عباسی، فاطمی، اموی (اندلس والے) تیموری تو سَو ہی دو سو برس میں اچھے خاصے رنگیلے بن گئے تھے،

ترکوں کی تہذیب و ترقی میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ قدر اور قابلِ تقلید ہے وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت و طریقۂ معاشرت ہے، دنیا کی دو بڑی قومیں یعنی یورپین اور ایشیاٹک اس مسئلہ میں افراط اور تفریط کے انتہائی کناروں پر واقع ہیں، اور اس وجہ سے دونوں کی حالت قابلِ اعتراض ہے، ترکوں نے ایسا معتدل طریقہ اختیار کیا ہے جو دونوں کی خوبیوں کا جامع اور دونوں کے عیوب سے خالی ہی، ٹرکش عورتیں تعلیم یافتہ ہیں، لیکن بے شرمی، شوخی، بیجا آزادی، رقاصی کی (اور وہ بھی غیر مردوں کے ساتھ) ان کو تعلیم نہیں ہوئی ہے، وہ پردے کی پابند ہیں لیکن جاہل دنیا سے بے خبر مکان کے قفس میں بند، حیوان انسان نما نہیں ہیں، لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سرکاری اور خانگی مدرسے کثرت سے ہیں، اور پردہ و حفاظت کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ شرفا کو اپنی لڑکیوں کے بھیجنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا، علمی مضامین کے ساتھ فرنچ زبان بھی درس میں داخل ہے، اور بعض بعض مدرسوں میں موسیقی کی تعلیم بھی ہوتی ہے معلمات کی تعلیم کے لئے ایک خاص مدرسہ ہے، جسکی مہتمم رفیقہ خانم ہے، یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون ہے، اور سلطان کے حضور سے اس کو درجہ دوم کا تمغہ عنایت ہوا ہے، صنعتی مدارس میں ایک مدرسہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے، جو کالج کہا جا سکتا ہے، اس کا مہتمم

عزیز آفندی ہے، اس مدرسہ کے ساتھ ایک بورڈنگ بھی ہے، جس کی مہتمم ایک فرنچ لیڈی مادام ہانلی ہے، بورڈنگ کا ایک سکریٹری تعلیم یافتہ ترک ہے، جس کا نام حسن آفندی ہے، صنعت کا ایک اور بڑا مدرسہ اسکیدار میں ہی جسکی معلمۂ اوّل خیریہ خانم ہے،

ان مدارس کی وجہ سے تعلیم اس قدر عام ہو گئی ہے کہ زمانہ حال میں مشکل ایسی عورت مل سکتی ہے، جس نے مناسب درجہ تک تعلیم نہ پائی ہو، بہت سی عورتیں مضمون نگار ہیں، اور مشہور اخبارات میں اُن کے آرٹیکل نکلتے رہتے ہیں، جودت پاشا کی لڑکی فاطمہ خانم مشہور مصنفہ ہے، حال میں اُس کی ایک نہایت عمدہ ناول شائع ہوئی ہے، جس کا نام "زنانِ اسلام"[1] ہے، عربی زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے، اور بیروت میں چھاپا گیا ہے، اور بھی چند عورتیں ہیں،

معنفہ عورتیں

عورتوں کو چلنے پھرنے میں عام آزادی حاصل ہے، ہر درجہ اور رتبہ کی عورتیں بازار میں نکلتی ہیں، سیرگاہوں کو جاتی ہیں، دعوت کے جلسوں اور علمی مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں، لیکن باوجود اس آزادی کے حفظِ احتیاط کے دائرہ سے سرمو تجاوز نہیں ہوتا، ہر مجمع میں عورتوں کی سوسائٹی مردوں سے الگ رہتی ہے، اور کوئی عورت کسی غیر مرد سے بجز خاص حالتوں کے بات تک نہیں کر سکتی،

عورتوں کو باہر نکلنے میں آزادی حاصل ہے

لباس بالکل یوروپین ہے، لیکن جب باہر نکلتی ہیں، تو نہایت ڈھیلا ڈھالا ریشمی گون پہن لیتی ہیں، جو گردن سے لے کر پاؤں تک ہوتا ہے اور اوپر سے نیچے تک بٹن لگے ہوتے ہیں، اس سے بجز چہرے کے تمام اور جسم اس طرح ڈھک جاتا ہے

عورتوں کا لباس

[1] اب یہ کتاب اُردو میں ترجمہ ہو کر محمڈن پریس علی گڈھ میں زیر طبع ہی،

کہ بدن کی ہئیت تک نہیں معلوم ہوتی، سر پر قصابہ ہوتا ہے، اور چہرہ ایک رومال سے چھپاتی ہیں، جو ناک کی جڑ سے ٹھوڑی تک ہوتا ہے، دونوں آنکھیں اور ناک کی جڑ اور کسی قدر آنکھوں کے نیچے کی سطح کھلی رہتی ہے، یہ رومال باریک ململ کے ہوتے ہیں، کوئی شخص پاس سے آنکھ جما کر دیکھے تو چہرہ کا رنگ معلوم ہو سکتا ہے لیکن ایسی بیہودہ جرأت کون کرسکتا ہے،

ایک دفعہ میں عاشر آفندی کے کتب خانہ میں بیٹھا ہوا تھا، ایک ترک صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، جن سے میری جان پہچان ہوگئی تھی، اتفاق سے وہیں اُنکی دو نوجوان لڑکیاں جن میں سے ایک کی شادی ہوچکی تھی، ان سے ملنے کے لئے آئیں، انھوں نے مجھ کو دونوں سے انٹرڈوس کرایا، جس احترام اور متانت و شرم سے وہ معصوم خاتونیں میرے سامنے کھڑی تھیں مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں نہیں بلکہ عفت و عصمت کی دیبیاں ہیں،

قسطنطنیہ میں ہندوستانی

ہندوستان میں کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ قسطنطنیہ میں ہندوستانی حضرات بھی تشریف رکھتے ہیں، خود مجھ کو گمان نہ تھا،

ہندوستانیوں کا اصلی مرکز تو ہندی زاویہ ہے، جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، وہاں اکثر ہندوستانی آنکلتے ہیں، لیکن وہ عموماً گدا پیشہ ہوتے ہیں، ان کے سوا تین چار شخص ہیں جو مستقل طور پر سکونت رکھتے ہیں، اور ان کی حالت اور حیثیت بھی بُری نہیں، ان کے نام اور مختصر حالات لکھتا ہوں،

نصرت علی خاں

نصرت علی خاں، یہ بزرگ اپنے تئیں دلّی کا کہتے ہیں، اُنھوں نے قسطنطینہ میں ایک اخبار بھی نکالا تھا، لیکن چونکہ اس کے مضامین انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے، انگلش سفیر نے باز پرس کی اور اخبار بند ہو گیا، اب محکمۂ تعلیم میں نوکر ہیں ڈیڑھ سو ماہوار تنخواہ ہے، ایک ترکی عورت سے شادی کر لی ہے، اس سے دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں خود سیاہ فام ہیں، لیکن لڑکیاں گوری چٹی ہیں،

مرزا بیگ

مرزا محمد بیگ، یہ بزرگ ملک اودھ کے رہنے والے ہیں، شاہی فوج میں معزز عہدہ پر مامور تھے، غدر سے پہلے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اب دس پندرہ برس سے قسطنطینہ میں رہتے ہیں، سلطان نے ڈیڑھ سو ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے، خوش اخلاق اور شریف الطبع آدمی ہیں،

حسن آفندی

حسن آفندی، بدر الدین طیب جی بیرسٹرایٹ لا ساکن بمبئی کے عموزاد بھائی ہیں، ہندوستانی اشیاء کی تجارت کرتے ہیں، پہلے ان کا کارخانہ بڑے فروغ پر تھا، چنانچہ اور مصارف کے علاوہ آٹھ سو ماہوار صرف دوکان کا کرایہ تھا، لیکن اب فیشن کے بدل جانے سے ان چیزوں کی قدر نہیں رہی، اور کارخانہ سست ہو گیا، تاہم خوش حالی سے بسر کرتے ہیں، مکان اور فرنیچر قسطنطینہ کے لحاظ سے امیرانہ ہے، ایک باغ بھی تیار کرایا ہے، تمام لوگ اُن کی عزت کرتے ہیں، سلطان کے یہاں سے تمغہ بھی ملا ہے، انگریزی بخوبی جانتے ہیں، نہایت خوش اخلاق، فیاض، روشن ضمیر، نیک طبع آدمی ہیں، ہندوستانیوں سے ان کو عجیب انس و محبت ہے، اور یہ حب الوطنی ہی میرے اور انکے تعارف کا ذریعہ ہوئی، ایک دفعہ میں بازار میں پھر رہا تھا، آفندی موصوف سامنے سے گذرے، مجھ کو دیکھ کر بے اختیار بڑھ کر پوچھا،

"آپ ہندوستانی تو نہیں"۔ اس وقت میرا لباس عربی تھا، طرہ یہ کہ جواب میں
اتفاقاً زبان سے بجائے ہاں کے نعم کا لفظ نکلا تاہم میرا ہندی ہونا کیونکر چھپ
سکتا تھا، وہ گلے سے لپٹ گئے، اور بولے کہ "آپ تو ہماری چیز ہیں، ہم سے بچ کر
کہاں چلے تھے"، میں جب تک وہاں رہا، اکثر میرے مکان پر تشریف لاتے تھے،
کئی دفعہ دعوت کی اور اپنے گھر لے گئے، معلوم نہیں یہ مہمان نوازی ان کی طینت
کا خمیر ہے، یا قسطنطنیہ کی آب و ہوا کا خاصہ ہے، ان کا پتہ یہ ہے، قسطنطنیہ مجوہر
بدستاندہ حاجی حسن علی آفندی ہندی؛

میں نے پتہ اس غرض سے لکھا ہے کہ کوئی صاحب قسطنطنیہ کا قصد کریں تو ان سے
ضرور ملیں، ان سے بڑھکر کوئی غمخوار نہیں مل سکتا ہے،

قسطنطنیہ کے احباب

نہایت ناشکری ہو گی، اگر میں قسطنطنیہ کی پُر لطف داستان ختم کروں اور
ان محبت کیش دوستوں کا نام نہ لوں جو اس چندروزہ اقامت میں میرے یار غمگسار
بن گئے تھے، اور جلوت وخلوت میں ہمدم و ہمراز رہتے تھے، چنانچہ شیخ
عبدالفتاح اور شیخ علی ظبیان کے سوا جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، باقی دوستوں
کے نام اور مختصر حالات لکھتا ہوں،

فواد بک، مکتب ملکیہ کے ایک ممتاز طالب علم ہیں، دمشق کے قریب حصبایہ
ایک موضع ہے، جہاں حضرت خالد بن الولید کی نسل سے ایک خاندان آباد
ہے، یہ لوگ دولت مند ہیں، اور اس کے ساتھ ملکی اثر رکھتے ہیں، چنانچہ

ترکی حکومت کی طرف سے اب تک ان اضلاع کا جو حاکم مقرر ہوتا تھا، اسی خاندان سے انتخاب کیا جاتا تھا، فواد سے میری ملاقات عزیزانہ تعلق کی حد تک پہنچ گئی تھی، ان کے ایک بھائی سامی بک ان ہی دنوں قسطنطنیہ آئے اور میں نے جو مکان کرایہ پر لیا تھا، اسی کے ایک کمرہ میں فروکش ہوئے، وہ مکتب الحقوق میں داخل ہونے کی تیاری کرتے تھے، اور چونکہ امتحانِ داخلہ میں منطق کا بھی امتحان ہوتا ہے، مجھ سے درخواست کی کہ میں مختصر طور پر اُن کو منطق کے تمام مسائل پر عبور کرادوں، اگرچہ میرا حرج اوقات تھا تاہم ان کی خاطر سے میں نے ان کو اور ان کے ساتھ دو تین اور طالب علموں کو ایساغوجی پڑھائی، حسنِ اتفاق یہ کہ امتحانِ داخلہ میں وہ لوگ پاس بھی ہوگئے، اس طرح دوستی اور محبت کا رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا، شام کو ہمیشہ ہم تین چار آدمی ایک قہوہ خانہ میں جو عین لب دریا ہے، ساتھ بیٹھا کرتے، اور عجب لطف و مزے کی صحبت رہتی تھی، کبھی کبھی مغرب کے بعد کشتی کرایہ کرتے اور سمندر کی سیر کرتے پھرتے، فواد کو گانا آتا ہے، مزے میں آکر عربی گیت گایا کرتے، ایک دن مجھ سے فرمائش کی کہ کوئی ہندی چیز سناؤ، میں نے بہیترا کہا کہ "بھائی میں مولوی آدمی ہوں مجھ کو گانے سے کیا واسطہ" لیکن وہ کب مانتے تھے، آخر مجبور ہو کر میں نے اردو کے دو تین شعر آواز کو گھٹا بڑھا کر پڑھے، اور کہا کہ ہندی یوں ہی گاتے ہیں،

عبدالسلام آفندی

عبدالسلام آفندی، بیت المقدس میں سادات کا ایک مشہور خاندان ہے یہ اس کے ایک معزز ممبر ہیں، بیت المقدس کے مفتی جن کا ذکر آگے آئیگا، اسی خاندان سے ہیں، یہ پہلے جنٹ مجسٹریٹ تھے، کسی وجہ سے معزول ہوگئے،

اور اسی فکر میں یہاں آئے ہیں، نہایت لائق فائق، تعلیم یافتہ اور زندہ دل آدمی ہیں،
ایک مدت تک میں اور یہ ایک ہی مکان میں رہے اور اس وجہ سے زیادہ میل جول
ہو گیا، اکثر علمی بحثیں کیا کرتے تھے، فلسفۂ حال سے واقف اور اس کے معترف ہیں،
ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا کوئی مسئلہ فلسفۂ حال سے مخالف نہیں، اکثر اسی امر کے
متعلق گفتگو کیا کرتے تھے، میں اُن کی مسافر نوازی اور اسلامی ہمدردی کا ازبس ممنون
ہوں، ایک مشکل موقع پر اُنھوں نے میرے ساتھ جو تعجب انگیز ہمدردی کی اس کا
ذکر مناسب موقع پر آئے گا،

خواجہ آفندی، معزز آدمی ہیں، درویش پاشا کی بھتیجی ان سے بیاہی ہے، اور
پاشائے موصوف ان کو نہایت عزیز رکھتے ہیں، ان ہی کے مکان میں یہ رہتے بھی ہیں،
میں چند بار ان سے ملا، فارسی بہ تکلف بول لیتے ہیں، نہایت خوش اخلاق اور
منکسر المزاج آدمی ہیں، ہمیشہ چائے اپنے ہاتھ سے بنا کر پلاتے تھے، ایک بار میری
قیامگاہ پر بھی تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے رہے، خونگر صوی کی سیر مجھ کو ان ہی
نے کرائی تھی،

ملا محمد آفندی، موصل کے رہنے والے ہیں، عربی بقدرِ ضرورت پڑھی ہے، فارسی
اچھی طرح بول سکتے ہیں، ان کی معاش کا کوئی ذریعہ نہیں، مجبوراً نہ ایک تکیہ میں رہتے
ہیں، اور فقر و فاقہ سے بسر کرتے ہیں، بایں ہمہ نہایت باحمیت اور غیرت مند
ہیں، میں نے جب ترکی سیکھنے کا ارادہ کیا تو ایک دوست نے ان کا نام لیا، اس وقت
تک مجھ کو اُن سے بالکل تعارف نہ تھا، اس لئے میں نے عے رما ہوار یران کو
مقرر کرنا چاہا، یہ رقم اُن کے لئے عطیۂ غیبی تھی، لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ میں

صرف تحقیقاتِ علمی کے لئے یہاں آیا ہوں تو معاوضہ لینے سے انکار کیا، اور مفت پڑھاتے رہے، اکثر میری قیامگاہ پر آکر پڑھا جایا کرتے تھے ٹوٹی پھوٹی ترکی جو میں نے سیکھی ان ہی سے سیکھی، افسوس ہے کہ وہ بھی محفوظ نہیں رہی،

ان دوستوں کے سوا اور بہت سے چشم آشنا احباب پیدا ہو گئے تھے جن کا ذکر چنداں ضروری نہیں،

غازی عثمان پاشا کی ملاقات اور تمغۂ مجیدی کا عطا ہونا،

یہ وہی نامور جنرل ہے، جس نے پلونا میں چوبیس ہزار روسی مجروح اور آٹھ ہزار تہ تیغ کئے تھے، جس کے مقابلہ میں شہنشاہِ روس نے اپنی کل فوجی قوت صرف کر دی تھی، اور خود سپہ سالار بن کر گیا تھا، جس نے باوجود فوج کی کمی اور رسد کی قلت کے روس کی مجموعی طاقت کا مدت تک مقابلہ کیا، اور میدانِ جنگ میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا تو خود شہنشاہِ روس نے اس کی کمر میں تلوار باندھی، اور مہینوں تک مہمان رکھا، یہ واقعات اسی زمانہ میں اخبارات کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے، اور بچہ بچہ اس نامور بہادر کے نام سے واقف ہو گیا تھا، قسطنطنیہ میں اگرچہ میں کسی فوجی افسر سے نہیں ملا، اور نہ ملنا چاہا، لیکن یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے نادرۂ روزگار کے دیکھنے کا شوق دل میں نہ ہوتا،

پاشائے موصوف اگرچہ اس رتبہ کے آدمی ہیں کہ ٹرکی میں کوئی شخص ان سے

بڑھ کر بلکہ ان کی برابر بھی نہیں، اور اس لحاظ سے مجھ کو ان تک رسائی کی کم امید ہو سکتی تھی، تاہم شوق کی بیتابی نے نہ مانا، اور میں ایک مترجم کو ساتھ لے کر ان کے مکان پر گیا، گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا، دربان نے اندر جانے کی اجازت دی، قاعدہ کے موافق ملاقاتیوں کے کمرہ میں جا کر بیٹھا، ایک معزز ترک وہاں تشریف رکھتے تھے، نہایت مہربانی سے پیش آئے، اور مزاج پرسی کے بعد قہوہ منگوایا، تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ہوئی، پاشاے موصوف زنانے میں تھے، کہلا بھیجا کہ ذرا دیر میں آتا ہوں، قریبًا دس منٹ کے بعد ایک ملازم آیا، اور مجکو بالاخانہ پر لے گیا، ایک خوبصورت کمرہ آراستہ تھا، ہم وہاں بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد پاشاے موصوف تشریف لائے، جن صاحب کو میں نے مترجمی کے لئے ساتھ لیا تھا، سررشتۂ تعلیم کے ایک افسر تھے، اُنھوں نے حسبِ قاعدہ آگے بڑھکر پاشاے موصوف کے دامن کا کنارہ چوما اور مودبانہ طور سے پیچھے ہٹے، میں نے طریقۂ سنت کے موافق سلام کیا، پاشاے موصوف نے سلام کا جواب دیا، اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، مزاج پُرسی کے بعد نام اور مقام پوچھا، مترجم نے کہا کہ "ہندوستان کے علمار میں سے ہیں، اور تحقیقات علمی کی غرض سے آئے ہیں" یہ سنکر نہایت مہربانی اور توجہ ظاہر کی، اور دیر تک مسلمانوں کے حالات پوچھتے رہے، رخصت ہو کر میں اٹھا تو خود بھی اُٹھے اور کہا کہ آپ دوبارہ تشریف لائیں تو مجھ کو خوشی ہوگی،

پاشاے موصوف پست قامت ہیں، دوہرا بدن ہے، رنگ گورا اور چمکتا ہوا ہے، چہرے سے ہیبت اور شجاعت ٹپکتی ہے، عمر ۶۰، ۷۰ کے بیچ میں ہے، لیکن بڑھاپے کا مطلق اثر نہیں ہے، فارسی بقدر ضرورت جانتے ہیں، اور چونکہ

ایک مدت تک یمن کے گورنر رہ چکے ہیں، عربی میں بے تکلف بات چیت کر سکتے ہیں،
پلونا کے واقعہ کے بعد سلطان نے ان کو کمانڈر انچیف اور صیغۂ جنگ کا وزیر کر دیا
تھا، لیکن چونکہ اس عہدہ کی وجہ سے وہ سلطان کی خدمت میں ہمیشہ حاضر نہیں رہ سکتے
تھے، سلطان نے اس عہدہ پر فواد پاشا کو مقرر کر دیا، اوران کو ماین کی افسری دی،
جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر سلطان کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں، سلطان کو پاشائے
موصوف سے زیادہ کسی عزیز و قریب یا نوکر اور عہدہ دار پر اعتماد نہیں ہے، اور اس
وجہ سے ان کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے، جمعہ و عید کو جب سلطان مسجد
میں تشریف لاتے ہیں، تو ان کے ساتھ گاڑی میں عثمان پاشا کے سوا اور
کوئی شخص نہیں ہوتا،

دوسری دفعہ میں ملاقات کو گیا تو پہلے سے کمرے میں آبیٹھے، میں اندر داخل ہوا
تو کرسی سے اُٹھ کر دو ایک قدم بڑھے اور پہلے دن کی طرح ہاتھ ملایا، اس کے بعد
میں جب ان سے ملا تو اسی طریقہ سے ملے، پاشائے موصوف مجھ پر نہایت مہربان
ہو گئے تھے، جب میری روانگی کا زمانہ قریب آیا، اور میں نے ان سے کہا کہ اب
میں یہاں دو چار دن کا مہمان ہوں، تو فرمایا کہ ایک دو دن جانے سے پہلے مجھ سے
مل لینا، اسی اثنا میں اُنھوں نے سلطان سے میرے لئے تمغہ مجیدی عطا ہونے
کی درخواست کی اور منظور ہو گئی، لیکن مجھ کو اس کی کچھ اطلاع نہ تھی، ایک دن دوپہر
کے وقت میں اپنے مکان میں سو رہا تھا کہ میرے ایک دوست دوڑے ہوئے آئے
اور جگا کر کہا کہ یا شبلی واللہ لقد طلع لک النیشان، مجھ کو ایک گونہ
تعجب ہوا اور میں نے کہا کہ یوں ہی کہتے ہو، آخر تمکو معلوم کیونکر ہوا، بولے کہ تمام

اخبارات میں چھپ گیا ہے، میں اسی وقت اُٹھا اور ایک قرأت خانہ میں جا کر اخبار دیکھے تو واقعی وہ خبر صحیح تھی، اسی وقت مجھ کو خیال پیدا ہوا کہ میں انگریزی رعیت ہوں، اس لحاظ سے انگلش سفیر کو اس کی اطلاع دینی ضرور ہے، دوسرے دن میں سفیر کے پاس گیا، اتفاق سے وہ مکان پر نہ تھے، میں اپنا کارڈ چھوڑ آیا، دوسرے دن تمام احباب مبارک باد کو آئے، میں نے ایک مختصر سا جلسۂ دعوت ترتیب دیا، شیخ علی ظبیان، عبد السلام آفندی، فواد، سامی، شریف اور دیگر احباب شریک جلسہ تھے، دعوت کی صبح کو عثمان پاشا کی وداعی ملاقات کو گیا، تمغہ کی خبر ایسی عام ہو گئی تھی کہ پاشائے موصوف کے مکان پر پہنچا تو سب سے پہلے دربان نے کہا تمغۂ مجیدی مبارک، مجھ کو تعجب ہوا کہ اس کو کیونکر خبر ہوئی، معلوم ہوا کہ یہاں امرا اور پاشاؤں کے نوکر چاکر عموماً پڑھے لکھے ہوتے ہیں، اور فرصت کے اوقات میں اخبارات پڑھا کرتے ہیں، پاشائے موصوف نے ملاقات کے ساتھ تمغہ کی مبارکباد دی، تمغہ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا، بکس سے نکال کر پہلے انھوں نے آنکھوں سے لگایا (سلطان کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی بھی ترک لوگ اس حد تک تعظیم کرتے ہیں) پھر مجھ کو حوالہ کیا، میں سرو قد کھڑا ہو گیا، اور سلطان کو دعا دی کچھ دیر کے بعد رخصت کے ارادے سے اُٹھا تو پاشائے موصوف نے فرمایا ذرا دیر اور تشریف رکھئے، یہ کہکر دوبارہ قہوہ منگوایا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اخیر میں فرمایا کہ میں آپ کی
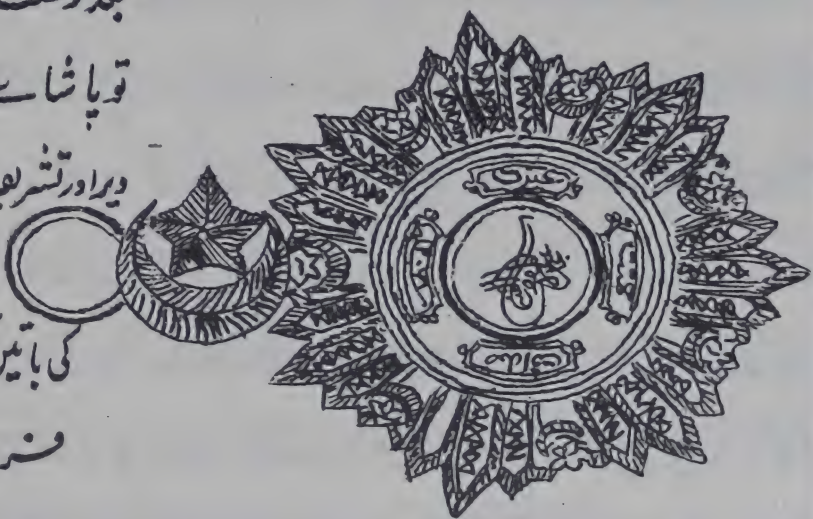
تشریف آوری کا مشکور ہوں، چلتے چلتے کہا کہ ہندوستان پہنچکر تمام مسلمانوں اور بالخصوص علما اور فضلا کی خدمت میں میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ عثمان آپ لوگوں سے دلی محبت رکھتا ہے، میں نے نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ شکریہ ادا کیا، پاشاے موصوف نے مجھ کو اپنی عکسی تصویر عنایت کی، اور اس پر دستِ مبارک سے یہ الفاظ لکھے، اشبو فوٹوغرافم شبلی النعمانی آفندی یہ ہدیہ المشدر محرم الحرام سنہ ۱۳۱۰ ہجری، یعنی "میں نے اپنا یہ فوٹو غراف شبلی نعمانی کو ہدیہ دیا" یہ تصویر اس وقت میرے پاس موجود ہے، اور میں اس کو ایک بڑا تبرک اور نشانِ فخر سمجھتا ہوں، جو میرے خاندان اور میری نسل میں ہمیشہ یادگار رہے گا، تمغہ کے ساتھ جو فرمان عطا ہوا، اس کی نقل ذیل میں ہے،

عثمان پاشا کا فوٹو

نقل فرمان بخط فارسی

"ہندوستانن علی گڈھ نام محلندہ کائن دار المعلمین معلم اولی شبلی النعمانی آفندی نن شایان لمطفات سینہ شاہانہ م اولد نغینہ بناءً اشرف افزاے سنوح و صدور اولان امر و فرمان معالی عنوان پادشاہانہ م موجب عالیسی اوررہ کندوسنہ مجیدی نشان ذیشانک وردنجی رتبہ سندن بر قطعہ سی عنایت و احسان قلنمش اولدیغی متضمن اشبو برات عالیشانم تصدیر اولندی حرر فی الیوم الرابع عشر من شہر محرم الحرام سنہ عشر و ثلث مائۃ "

ترجمہ

شبلی النعمانی آفندی جو دار المعلمین علی گڈھ واقع ہندوستان کا معلم اول ہے

چونکہ شاہانہ تلطفات کا مستحق خیال کیا گیا ہے، اسلئے اس کو تمغۂ مجیدی درجہ چہارم کے عطا ہونے کے لئے حکم والا صادر ہوا، اور اس کی سند کے لئے یہ فرمان عالیشان صادر ہوا، تحریر ۱۴ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ"

یہ عجیب اتفاق کہ میں نے تمغہ کو قسطنطنیہ بیروت، مصر کسی مقام میں کبھی استعمال نہیں کیا، ہندوستان میں پہنچکر خیال ہوا کہ گورنمنٹ سے اجازت حاصل کر کے استعمال کروں، چنانچہ جناب ہرسین صاحب مجسٹریٹ علی گڈھ نے باضابطہ چھٹی کے ذریعہ سے گورنمنٹ میں سفارش کی، وہاں سے جواب آیا کہ رزولیوشن مورخہ ۲ مئی ۱۸۸۶ء ملاحظہ طلب ہے اس رزولیوشن کا ماحصل یہ ہے کہ "گورنمنٹ انگریزی کی کوئی رعیت کسی دوسری سلطنت کا کوئی نشان یا تمغہ استعمال یا قبول نہیں کر سکتی تا آنکہ پہلے جناب ملکہ معظمہ سے اجازت نہ حاصل کی جائے"، اس حکم کی تعمیل کے موافق میں تمغہ کو استعمال نہیں کرتا،

قسطنطنیہ سے روانگی ۲۶ محرم ۱۳۰۹ھ

قسطنطنیہ میں میں پورے تین مہینے مقیم رہا، اخیر اخیر طبیعت اچاٹ ہو چلی تھی، یہاں تک کہ میں سلطان کے جشنِ تخت نشینی کا بھی انتظار نہ کر سکا، قسطنطنیہ میں ہر سال صفر کی آٹھوین رات جو سلطان کی تخت نشینی کی رات ہے، بڑی دھوم دھام سے جشن ہوتا ہے، تمام شہر میں چراغاں کیا جاتا ہے، شہر کے تمام باشندے اپنے اپنے مکانوں میں بڑے تکلف اور اہتمام سے روشنی کرتے ہیں، اور چونکہ یہ طریقہ سلطان کے ساتھ خلوص اور محبت کی دلیل ہے، امرا اور پاشاؤں کے یہاں حد سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے، شیخ علی ظبیان نے مجھ سے کہا کہ پچھلے سال درویش پاشا کے

الرابع عشر شهر محرم الحرام سنة عشر وثمانمائة

الولد

مکان میں چودہ ہزار مومی گلاس روشن کئے گئے تھے، سڑک پر جس قدر مکانات ہیں،
ان کے دروازوں پر روشنی کے حرفوں میں یہ عبارت لکھی ہوتی ہے، "پادشاہم چوق لیشا"
یعنی ہمارا بادشاہ بہت زندہ رہے"۔ یہ طریقہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے،
بلکہ فرنچ، جرمن، انگریز اور اور یورپ کی قومیں جو یہاں مقیم یا خوشباش ہیں
ان کے دروازوں پر بھی یہ فقرہ روشنی کے حرفوں میں لکھا ہوتا ہے،

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ میں یہ پُرلطف اور پرجوش تماشا نہ دیکھ سکا، برخاستگی
طبیعت کے ساتھ کچھ ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ زیادہ ٹھہرنا ممکن نہ تھا، لوگوں
نے یہ بھی کہا کہ ترکی حکومت میں ہر جگہ یہ جشن ہوتا ہے، تم جہاں کہیں ہو گے یہ سیر
دیکھ سکو گے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ دار السلطنت میں جو شان وشوکت اور
اہتمام ہوتا ہے، وہ دوسرے مقامات میں کیونکر ہو سکتا ہے، طرہ یہ کہ مجکو بدقسمتی
سے اس جشن کی معمولی سیر بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی، کیونکہ اس تاریخ کو میں عالم آب
میں تھا، یعنی جہاز پر سوار تھا، اور آبادی سے دور آچکا تھا،

روانگی کے وقت احباب کی مشایعت

یاد ہو گا کہ میں جب قسطنطنیہ میں داخل ہوا تھا تو یکہ وتنہا تھا، لیکن واپسی کے وقت
دوستوں کا ایک گروہ ساتھ ہے، تمام احباب بندرگاہ تک ساتھ آئے ہیں، رخصت
کے وقت بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں، اور دعائیہ الفاظ کے ساتھ خط وکتابت
اور دوستانہ مراسم جاری رکھنے کے وعدے لیتے ہیں،

جہاز پر پہنچا تو حسن ہندی پہلے سے میرے انتظار میں وہاں موجود تھے،
ان سے مل کر نہایت خوشی ہوئی، دیر تک لطف ومحبت کی باتیں رہیں، شام کے
قریب جہاز نے لنگر اُٹھایا، شیخ علی ظبیان جو اسی جہاز پر اپنے وطن دمشق کو جا رہے تھے

میرے ہمسفر اور مونس و غمگسار تھے، جہازہ، روڈس، سمرنا، سائپرس ہوتا ہوا بیروت پہنچا، ایک دن جہاز پر عجب برہمی اور بے لطفی ہوئی، سائپرس میں دو شہر ہیں، لرنکہ اور لمونہ دونوں جگہ جہاز لنگر کرتا ہے، لرنکہ میں جو لوگ جہاز پر سوار ہوئے، ان میں سائپرس کا ایک رئیس تھا، اور چونکہ اس کو صرف لمونہ تک جانا تھا، تیسرے درجہ کی چھت پر ہمارے دوست شیخ علی ظبیان کے بستر کے قریب آبیٹھا، شیخ موصوف باوجود فضل وکمال کے تنک مزاج آدمی ہیں، رئیس مذکور نے ان کے بستر پر کوئی چیز رکھدی اتنی بات پر یہ برہم ہو گئے، وہ غریب تو چپ رہا، لیکن اس کا نوکر جو صورت سے قوی اور تنومند معلوم ہوتا تھا، ضبط نہ کر سکا، بات زیادہ بڑھی، یہاں تک کہ جہاز کے اور مسافر جو اکثر شامی عرب تھے ادھر اودھر سے آکر جمع ہو گئے، عربوں کا سہارا پاکر ہمارے دوست زیادہ تیز ہوئے، نوکر نے کہا آپ غصہ کیوں کرتے ہیں؟ ہم آپ کی کچھ رعایا نہیں ہیں، ہمارا شہر انگریزی حکومت سے تعلق رکھتا ہے،

ان الفاظ کا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ تمام عرب برہم ہو گئے، یہاں تک کہ ایک عرب نے کمر پکڑ کر اس کو اٹھا لیا اور کہا کہ "مردود! تجھ کو دریا میں پھینک دیتا ہوں"! اگرچہ ہجوم کی وجہ سے نہایت کشمکش تھی، اور بعض آدمی اس کو روکتے بھی رہے تاہم وہ لوگوں کو ہٹاتا ہوا جہاز کے کنارہ تک پہنچ گیا، اور اس زور سے دو تین جھٹکے دیئے کہ قریب تھا کہ وہ غریب سمندر میں جا پڑے، اس وقت چند آدمیوں نے نوکر کو بزور اس کے قبضہ سے چھڑا کر اشارہ کیا کہ کمبخت جہاز کے کسی گوشہ میں چھپ جا، پھر بھی تمام عرب دیر تک غل کرتے اور انگریزی حکومت کی شان میں نامناسب الفاظ کہتے رہے، مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ جہاز کے افسر

یہ ہنگامہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور مطلق دخل نہیں دیتے تھے،

بیروت میں قیام کا سبب

ساتویں دن ہمارا جہاز بیروت پہنچا، شیخ علی ظبیان جہاز سے اُترے، میں بھی ان کے ساتھ اس ارادہ سے اترا کہ جہاز کے روانہ ہونے تک واپس آجاؤں گا، شہر میں پہنچکر معلوم ہوا کہ شیخ طاہر مغربی اتفاقات سے آج کل یہیں ہیں، شیخ موصوف دمشق میں مدرس ہیں اور ان کے فضل و کمال کی ان اطراف میں بڑی شہرت ہے، میں نے قسطنطنیہ میں ان کے اوصاف سنے تھے، شیخ علی ظبیان نے کہا، تم کو ان ممالک میں دوبارہ آنا نہیں ہے، شیخ طاہر کی ملاقات کا موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے، غرض ان کی صلاح سے میں جہاز سے اپنا اسباب اتروالایا، اور ایک ہفتہ تک بیروت میں مقیم رہا، چونکہ یہ شہر صوبہ دمشق کا اسٹیشن اور اضلاعِ شام میں تہذیب و تمدن کا مرکز خیال کیا جاتا ہے، اس لئے میں اس کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں،

بیروت

یہ نہایت قدیم شہر ہے، مورخین اس کے زمانہ تعمیر کی ٹھیک تعیین نہیں کر سکتے، لیکن اس قدر یقینی ہے، کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے پیشتر موجود تھا، ۲۲۲ سنہ ء میں جب اسکندر سفیروس، رومۃ الکبریٰ کی مسندِ حکومت پر بیٹھا تو یہاں قانونی تعلیم کی بہت بڑی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی، جو کئی سو برس تک بڑے اوج پر قائم رہی ۱۳ سنہ ہجری میں اسلام کے قبضہ میں آیا، لیکن زمانۂ مابعد میں کئی بار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر عیسائیوں کے قبضہ میں آیا، یہاں تک کہ ۱۵۱۷ سنہ ء میں سلطان سلیم اوّل نے اس کو فتح کیا، اور اس وقت سے آج تک ترکوں کے زیر حکومت ہے،

اس موجودہ ترقی کی ابتدا ۱۸۴۲ء ہے اور اس وقت سے آج تک تجارت اور
آبادی کو روز افزوں ترقی ہے، بیس برس پہلے اس کی مردم شماری چالیس ہزار تھی،
۱۸۷۵ء میں ستر ہزار ہو گئی اور اب ایک لاکھ سات ہزار چار سو ہے، جس میں
۳۳۰۰۰ مسلمان ہیں، باقی عیسائی اور کچھ یہودی اور دروزی ہیں، شہر کا قدیم حصہ
نہایت خراب ہے، سڑکیں اور گلی کوچے تنگ اور ناہموار اور مکانات پست اور
کم فضا ہیں، لیکن جدید حصہ نہایت پُر رونق اور خوش نما ہے، ہوٹل، سرائیں، قہوہ خانے
کثرت سے ہیں، ایک قہوہ خانہ عین دریا میں ہے اور عجیب فضا کی جگہ ہی،

زبان یہاں کی عموماً عربی ہے، عیسائی اور یہود وغیرہ سب عربی بولتے ہیں،
لباس اور وضع، عرب کے قریب قریب ہے، لیکن پاجامہ کابلیوں کے انداز کا
ہوتا ہے، میانی سونڈ کی طرح زمین تک لٹکتی ہے، اور یہ بڑا حسن سمجھا جاتا ہے، ایک
پاجامہ دس بارہ گز سے کم میں نہیں تیار ہوتا، مسلمان، عیسائی، دروزی سب یہی لباس
پہنتے ہیں، البتہ نئے تعلیم یافتہ کوٹ پتلون پہننے لگے ہیں، آب و ہوا کسی قدر مرطوب
ہے، تاہم مشہور یہ ہے کہ تندرستی کے لئے بہت مفید ہے، یہاں تک کہ اور اور
مقامات سے لوگ تبدیل ہوا کے لئے یہاں آتے ہیں، شاید ایسا ہی ہو لیکن میرا
تجربہ اس کے خلاف ہے، میں جب تک وہاں رہا طبیعت بد مزہ رہی، دو تین
دن بخار بھی آیا، اور علاج کی ضرورت پڑی، البتہ لبنان جو ایک مشہور پہاڑ
ہے، اور یہاں سے تین چار میل ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے مشہور جگہ ہے، متنبی
نے اسی کی نسبت کہا ہے،

وعقاب لبنان وکیف بقطعہا وھی الشتاء وصیفھن شتاء

بیروت
کی
علمی ترقی اور مدارس وغیرہ

بیروت میں علمی ترقی

بیروت میں علمی ترقی اگرچہ تھوڑے زمانہ سے شروع ہوئی ہے لیکن جس تیزی سے یہ شہر ترقی کر رہا ہے، اور ترقی کی جس حد تک آج پہنچ چکا ہے، اس کے لحاظ سے تمام ممالکِ اسلامیہ میں قسطنطنیہ کے سوا کوئی شہر اس کا ہمسر نہیں ہے، اور بعض خصوصیتوں میں تو اس کو قسطنطنیہ پر بھی ترجیح ہے،

عربی زبان کے ساتھ اعتنا،

عیسائیوں کی ایک جماعت نے عربی زبان پر نہایت توجہ کی ہے اور وہ ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، ان لوگوں نے نہایت کوشش سے دور دور سے عرب کے قدیم دواوین بہم پہنچائے ہیں، اور ان کو چھاپ کر شائع کیا ہے، خنسا عنتر بن شداد العبسی، اسمٰعیل ابوالعتاہیہ، ابن ہانی، ابو فراس وغیرہ کے دیوان انہی لوگوں کی بدولت ہم تک پہنچے، ورنہ ان کا نام و نشان بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا، عرب کے عیسائی شاعروں کے کلام کے ساتھ (اتحاد مذہب کی وجہ سے) اور بھی زیادہ اعتنا کیا ہے، ان تمام شعراء کے اشعار جمع کئے ہیں، اور ان کا ایک سلسلہ چھاپنا شروع کیا ہے، تین چار جلدیں چھپ چکی ہیں، اور باقی تیار ہو رہی ہیں اس میں جاہلیۃ اور اسلام دونوں زمانہ کے شعراء داخل ہیں اخطل نصرانی جو فرزدق

اور جریر کا معاصر اور دولتِ بنی اُمیہ کا مشہور شاعر تھا، اس کا دیوان نہایت کوشش اور اہتمام سے مستقل طور پر چھاپا ہے، یہ دیوان نہایت نایاب اور عزیز الوجود تھا، یہانتک کہ قسطنطنیہ اور مصر کے کتب خانے بھی اس سے خالی تھے، صرف شہنشاہِ روس کے کتب خانہ میں ایک نسخہ تھا، چنانچہ اس کی نقل و کتابت کا انتظام کیا گیا، اور سینٹ پٹرسبرگ یونیورسٹی کے عربی پروفیسر نے اس کی تصحیح کی، یہ قلمی نسخہ جس کو پروفیسر مذکور نے خود اپنے ہاتھ سے صحیح کیا تھا، مجھ کو دکھلایا گیا، اور میں نے ان عیسائیوں کی بلند ہمتی اور ذوقِ علمی کا دل سے اعتراف کیا، مسلمانو! تم کو بھی کچھ غیرت آتی ہے؟

ان لوگوں نے خود بھی فن ادب کے متعلق مفید تالیفات کی ہیں، چنانچہ روضۃ الادب فی طبقات شعراء العرب، مجانی الادب، شرح مجانی الادب مشہور اور شائع ہو چکی ہیں، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان عالموں نے ادب میں جو مفید کتابیں لکھی ہیں، وہ بھی انہی عیسائیوں کی بدولت یعنی عیسائیوں نے ان کو اجرت اور صلہ دیکر یہ کتابیں تصنیف کرائیں، اور ان کو اپنے اہتمام سے چھاپا، اور شائع کیا، مقامات بدیع اور رسائلِ بدیعی کی شرحیں جو حال میں نہایت خوبی اور اہتمام سے چھپکر شائع ہوئیں اسی طریقہ سے تیار ہوئی ہیں، میں نے لوگوں سے پوچھا کہ ان لوگوں کو عربی زبان کے ساتھ اس قدر اعتنا کیوں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ لوگ اپنے تئیں عربی النسل کہتے ہیں اور اس انتساب پر انکو فخر ہے،

لٹریچر کا مذاق اس قدر عام ہے کہ بچہ بچہ کو شعر و شاعری کا چسکا ہے، بہت سے لوگ صاحبِ دیوان ہیں، اور دس پانچ قصیدے لکھنے والے تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں

ایک مشہور شاعر سے قہوہ خانہ میں ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ چالیس برس سے مشقِ سخن میں مصروف ہیں، البتہ یہ افسوس ہے کہ مذاق صحیح نہیں، غزل اور بیہودہ مدح سرائی کے سوا اور اصنافِ سخن سے نا آشنا ہیں، مضامین اور طرزِ شاعری کے لحاظ سے متاخرین کے سوا کسی کا کلام پسند نہیں کرتے ہیں اکثر صحبتوں میں جاہلیۃ اور ابتدائے اسلام کے شعرار کے اشعار پڑھتا تھا تو مجھ کو بد مذاق خیال کرتے تھے،

علوم و فنون جدیدہ

علومِ جدیدہ اور نئے مذاق کو بہت کچھ ترقی ہے، فلسفہ و صنائع و فنونِ جدیدہ کی اکثر کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں، بڑے بڑے کالجوں اور اسکولوں میں جو نصابِ تعلیم ہے اور جو یہاں کے انٹرنس اور ایف اے و بی اے کے برابر ہے، عموماً عربی زبان میں ہے، صرف ڈاکٹری کی تعلیم فرنچ زبان میں ہوتی ہے، جس کی وجہ ان لوگوں نے مجھ سے یہ بیان کی کہ اس فن کے متعلق روز بروز تجربہ کو ایسی ترقی ہوتی جاتی ہے، اور اس کثرت سے نئی نئی کتابیں تصنیف ہوتی جاتی ہیں کہ ترجمہ ان کا ساتھ نہیں دے سکتا، فلسفہ و علومِ جدیدہ کا بڑا ماہر اور مصنف پروفیسر فانڈیک ہے، جو امریکہ کا رہنے والا ہے، اور ایک مدت سے بیروت میں رہتا ہے، اس نے عربی زبان میں علومِ جدیدہ کا ایک مرتب سلسلہ تیار کر دیا ہے، جس کا نام "نقش فی الحجر" ہے، اس کے سوا اور بہت سی مستقل کتابیں لکھی ہیں، عربی زبان میں انسائکلوپیڈیا کا بالکل وجود نہ تھا، اس ضرورت کو پروفیسر بطرس نے پورا کیا، اس نے ۱۸۷۵ء میں اسکی ابتدار کی اور اوّل کی چند جلدیں لکھیں لیکن چونکہ اس کا انتقال ہو گیا، اس کے بیٹے سلیم آفندی نے تکمیل کا ارادہ کیا، اتفاق یہ کہ وہ بھی مر گیا، اب پروفیسر مذکور کا دوسرا بیٹا نجیب آفندی باقی جلدیں

تیار کر رہا ہے، دس ضخیم جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں،

تاریخ اور متعلقاتِ تاریخ پر نہایت مفید کتابیں لکھی گئی ہیں، اور چونکہ یہ لوگ عربی زبان کے ساتھ یورپ کی زبانوں سے بھی بخوبی واقف ہیں ان کی تصنیفات میں وہ جامعیت ہوتی ہے، جو یورپ والوں کی تصنیفات میں نہیں ہوتی، چنانچہ آثار الادہار جس جامعیت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے، اس دعوی کی شاہد عادل ہے، البتہ یہ افسوس ہے کہ ان عیسائیونکی تصنیفات میں مذہبی تعصب کا رنگ پایا جاتا ہے، چنانچہ صناجۃ الطرب اور اصول المعارف وغیرہ میں اس قسم کی بے اعتدالیاں صاف محسوس ہوتی ہیں،

یہ مصنفین اکثر **لبنان** کے رہنے والے ہیں، جن میں سے بہت سے لوگ بیروت میں آرہے ہیں، ان لوگوں نے اس کوہستان (لبنان) میں عجیب علمی مذاق پھیلا دیا ہے، اگرچہ یہ لوگ عموماً زمیندار یا کاشتکار ہیں، اور ضرورت کے وقت اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں، لیکن جس وقت ان کو ان ضرورتوں سے ذرا بھی فرصت مل جاتی ہے، علمی اشغال میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجودیکہ علم یہاں ذریعۂ دولت نہیں تاہم اس علاقہ میں کثرت سے اہلِ علم اور مصنفین پیدا ہوئے اور اب بھی موجود ہیں، خاص لبنان کے علماء اور شعراء کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف و تالیف جو کچھ ہے، عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے،

مدارس یہاں کثرت سے ہیں، جن میں سے مشہور مدارس کا نقشہ ذیل میں درج ہے،

نام مدرسہ	مذہب	بورڈنگ اور فیس کا خرچ سالانہ	تعداد طلبہ	تاریخ افتتاح مدرسہ
اسرائیلیہ	اسرائیلیہ	۲۰ پونڈ	۶۷	سنہ ۱۸۷۵ء
اعدادیہ	اسلام	"	۱۵۰	سنہ ۱۸۸۲ء
اکلیریکیہ	روم آرتھوڈکس	مفت	۰	۰
بطریریکیہ	رومن کیتھولک	۲۵ پونڈ	۱۳۷	سنہ ۱۸۶۶ء
الحکمۃ	مارونیہ	۰	۲۲۵	سنہ ۱۸۶۷ء
راہبات	لاٹین	مفت	۱۱۵	۰
الکلیۃ السوریۃ العلمیۃ یعنی شام کی علمی یونیورسٹی	انجیلیہ	۱۷ پونڈ	اس کا مفصل حال آگے آئیگا	سنہ ۱۸۶۵ء
الکلیۃ السوریۃ الطبیۃ یعنی شام کی مڈیکل یونیورسٹی	انجیلیہ	۲۲ پونڈ	۰	۰
قدائن یوسف	لاٹن	۳۰ پونڈ	۰	۰

عورتوں کی تعلیم کے مدارس بھی کثرت سے ہیں جنمیں سے مشہور مدارس یہ ہیں،

نام مدرسہ	مذہب	بورڈنگ اور فیس کا خرچ سالانہ	تعداد طلبہ	تاریخ افتتاح مدرسہ
باکورۃ الاحسان	روم آرتھوڈکس	۱۵ پونڈ	۰	۰
راہبات پروٹسٹنٹ	انجیلیہ	۳۰ پونڈ	۲۵۰	۰
"	"	مفت	۵۰۰	۰
عازریات یتامی	لیٹن	"	۰	۰
عازریات مجبہ	"	۲۵ پونڈ	۰	۰

عمارزیات ناصریہ	لیٹن	۳۰ پونڈ	۱۱۵	۰
سوریہ امیرکاینہ	انجلیسیہ	۱۲ پونڈ	۰	۰

مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو اور قوموں کی تعلیمی ترقی سے جو نسبت ہے وہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگی۔

تعداد مدارس ذکور	تعداد مدارس اناث	پروفیسروں اور ٹیچروں کی تعداد	زنانہ معلموں کی تعداد	تعداد طلبہ ذکور	تعداد طلبہ اناث	قوم
۲۱	۳	۵۰	۲۰	۲۰۰۰	۵۰۰	مسلمان
۴۶	۳۳	۳۳۷	۱۵۰	۶۷۳۰	۵۶۶۵	عیسائی و یہود وغیرہ

مسلمان طالب علموں کی یہ تعداد گو فی نفسہٖ کم ہے، لیکن یہ امر اور بھی زیادہ افسوس کے قابل ہے کہ اس تعداد میں بھی زیادہ تر ادنیٰ درجہ کی تعلیم والے شامل ہیں، ورنہ اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں، کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہ شہر اسلامی حکومت کا مرکز اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں یہاں حاکم و محکوم کی نسبت ہے تاہم تہذیب و تمدن میں مسلمانوں کو عیسائیوں سے کچھ نسبت نہیں، تعلیم کی جو حالت ہے، وہ نقشۂ بالا سے معلوم ہوئی ہوگی، تصنیف و تالیف کا حال اوپر گذر چکا، اخبارات، مطابع، تجارت وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ بدتر حالت ہے،

فاعتبروا یا اولی الابصار،

الکلیۃ السوریۃ العلمیۃ

یونیورسٹی

بیروت میں اگرچہ (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) بہت سے اسکول و کالج ہیں، لیکن یہ کالج یونیورسٹی ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام کلیہ سوریہ ہے کلیہ کا لفظ یہاں یونیورسٹی کے معنی میں اطلاق کیا جاتا ہے، اور سوریہ ملک شام کو کہتے ہیں، یعنی شام کی یونیورسٹی، میں نے اس کالج کو تفصیل کے ساتھ دیکھا اور اس وجہ سے اس کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہوں، یہ کالج ۱۸۶۵ء میں رومن کیتھولک پادریوں نے قائم کیا، پروفیسر اور ٹیچر قریباً ساٹھ ہیں جن میں سے اکثر کالج ہی کے احاطہ میں سکونت رکھتے ہیں،

میں جب اس کالج میں گیا تو شیخ علی ظبیان اور عبد الباسط آفندی ساتھ تھے، کالج کے دروازہ پر پہنچے تو عبد الباسط آفندی نے ہم کو وہیں ٹھہرا دیا، اور خود اندر گئے، تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے، ان کے ساتھ ایک اور متین شخص تھا، اس نے ہمارا استقبال کیا، اور ہمکو ساتھ لے کر چلا، کالج کی عمارت دو منزلہ ہے، نیچے کے درجہ میں چھاپہ خانہ ہے اور یہ وہی چھاپہ خانہ ہے جس نے عمدگی طبع کی وجہ سے بیروت کو تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے، جس شخص نے ہمارا استقبال کیا، اس کا نام الیاس ہے، اور چھاپہ خانہ کا تمام اہتمام اسی سے متعلق ہے، الیاس نے پہلے ہمکو مطبع کی سیر کرائی، تمام کام کل کے ذریعہ سے ہوتے ہیں، رولر کاغذ کو خود کھینچ لیتا ہے، حروف پر سیاہی لگ جاتی ہے، کاغذ دو رخہ چھپتا ہے اور زمین پر

گر جاتا ہے، حرف بھی یہیں ڈھالے جاتے ہیں، چنانچہ الیاس نے ہمارے سامنے چند حروف ڈھالے یہاں کے کارخانے کے حروفوں کی ایسی شہرت ہوگئی ہے کہ دور دور سے مانگ آتی ہے، لیکن یہ تعجب ہے کہ جو صفائی اور خوشخطی یہاں کی مطبوعہ کتابوں میں ہوتی ہے، اور کہیں نہیں ہوتی، میں نے الیاس سے اس کی وجہ پوچھی، اس نے کہا یہاں حروف کی خوبی کے علاوہ اور بھی بہت اہتمام کیا جاتا ہے، فرمہ اُتارنے کے بعد نمی دیکر ایک آلہ سے اس ترکیب سے دبایا جاتا ہے کہ حرفوں کا اُبھار بالکل جاتا رہتا ہے، اور کاغذ چکنا و صاف ہو جاتا ہے، چنانچہ اُس نے ہم کو دونوں طرح کے فرمہ دکھائے، اصلاح کیا ہوا فرمہ بعینہ پتھر کا چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا، میں نے صفائی طبع اور حرفوں کی موزونی کی بہت تعریف کی، الیاس نے کہا کہ اصل میں اس تعریف کا مستحق ابو الضیا ایک ترک ہے، جس نے یہ حرف ایجاد کئے ہیں، البتہ ہم نے اس کو زیادہ جلا دی ہے،

سازی مطبع ہی میں جلد سازی کا بھی کارخانہ ہے، نہایت عمدہ مطلّا و مذہب جلدیں تیار ہوتی ہیں، یہاں تک کہ شام و مصر سے فرمائشیں آتی ہیں، میں نے یہاں ہاتھی دانت کے پٹھے دیکھے، جو پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے،

کالج چھاپہ خانہ سے فارغ ہو کر ہم نے کالج کو دیکھنا چاہا، چونکہ اس کام کے لئے کالج کے کسی پروفیسر کا رہنما ہونا ضرور تھا، الیاس نے پہلے پروفیسر انطون سے ہماری ملاقات کرائی، یہاں ایک نہایت معقول طریقہ ہے، اور اس قابل ہے کہ ہمارے ملک میں اس کی تقلید کی جائے، کالج کے ملازم اور پروفیسر وغیرہ جو کالج میں سکونت رکھتے ہیں، ان کے کمروں کے صدر دروازہ پر ایک چھوٹی سی تختی

لٹکتی رہتی ہے، اس تختی پر جدا جدا سطروں میں صبح سے شام تک کے کاموں کی تفصیل
لکھی ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ خانہ کس وقت کہاں ہوتا ہے اور کیا
کام کرتا ہے؟ مثلاً پہلی سطر میں لکھا ہے، لکچر روم، دوسری میں کھانے کا کمرہ، تیسری میں
سیر و تفرج وعلی ہذا، تختی کی پیشانی پر ایک سوئی لٹکتی رہتی ہے، صاحب خانہ جس وقت
جس کام میں مصروف ہوتا ہے سوئی کو اس سطر کے سامنے تختی پر اٹکا دیتا ہی جسمیں
کام اور کام کے موقع کا ذکر ہے، جو شخص ملاقات کو آتا ہے اول اسکی نگاہ تختی پر پڑتی
ہے، اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحب خانہ اس وقت کہاں ہے، اور کس کام
میں ہے؟ مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ طریقہ کالجوں کے ساتھ مخصوص ہے، یا ہر طبقہ میں رائج
ہے، بہرحال یہ عمدہ طریقہ اس قابل ہے کہ ہر جگہ اس کی تقلید کی جائے،

پروفیسر انطون

غرض الیاس نے ہمکو پروفیسر انطون سے ملایا، پروفیسر مذکور نہایت قابل
اور لائق شخص ہے، فرنچ زبان خوب جانتا ہے، عربی علم ادب کا استاد ہے،
دیوان اخطل جو حال میں چھپا ہے اسی کی تصحیح اور اہتمام سے چھپا ہے، دیوان مذکور
پر اس نے جو حاشیے چڑھائے ہیں وہ مستقل شرح کے برابر ہے، اور اس سے اسکی
وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، کالج کا ہفتہ وار اخبار جو عربی زبان میں نکلتا ہی
اور جس کا نام البشیر ہے، اسی کی اڈیٹری میں نکلتا ہے، ہم نے اس کی وجہ
سے کالج کی ایک ایک عمارت اور آلات وغیرہ کی سیر کی، حقیقت یہ ہی کہ یہ کالج
یہاں کے عیسائیوں کے لئے باعثِ فخر اور تمام مسلمانوں کے لئے موجب رشک ہی
مصر و شام کا تو کیا ذکر ہے، قسطنطنیہ کا بھی کوئی کالج اس کی ہمسری کا دعوی نہیں
کرسکتا، عمارت اس قدر شاندار، موزوں اور خوبصورت ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا،

اوپر کی منزل کا فرش بالکل سنگ مرمر کا ہے اور سنگ سیاہ کی پچے کاری ہے، کمرے نہایت کثرت سے ہیں، پروفیسر اور ٹیچر جو ۶۰ سے زیادہ ہیں اور شب و روز کالج ہی میں رہتے ہیں، سب کے لئے الگ الگ کمرے ہیں، ایک عالیشان کمرہ جو نہایت عمدہ فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ ہے اور جس کے بیچ میں مستطیل میز اور گرد بہت سی خوبصورت کرسیاں بچھی ہیں، پروفیسروں اور استادوں کیلئے مخصوص ہے، فرصت کے اوقات میں وہ لوگ یہاں آ بیٹھتے ہیں، اور دوستانہ صحبت رہتی ہے، اس میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے جس کا جی چاہتا ہے کوئی کتاب اٹھالیتا ہے، اور اس سے دل بہلاتا ہے، مجھ کو اس وقت خیال آیا کہ ہمارے کالج میں یہ بڑی کمی ہے کہ اس قسم کی کوئی عمارت نہیں جہاں تمام اساتذہ گھڑی دو گھڑی مل بیٹھا کریں، حالانکہ اس قسم کی صحبت دل بہلانے کے سوا قومی مذاق کے لئے نہایت مفید ہے،

کالج میں سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے اور اس غرض سے نہایت بیش قیمت آلات اور نایاب چیزیں مہیا کی گئی ہیں، بہت سی الماریاں ہیں جن میں عجیب عجیب مختلف رنگ اور صورت کے پتھر اور حجری مٹی کے ٹکڑے ہیں، یہ نادر چیزیں طبقات الارض کی تعلیم کے لئے دور دور مقامات سے مہیا کی گئی ہیں، نباتات کا الگ کمرہ ہے، اور بہت وسیع ہے، پروفیسر الظون نے مجھ سے کہا کہ ان نباتات کی حفظ و پرداخت میں نہایت اہتمام کرنا پڑتا ہے، پروفیسر مذکور نے ایک قسم کی گھانس دکھائی اور کہا کہ یہ ہندوستان کے سوا اور کہیں نہیں پیدا ہوتی، اور وہیں سے منگوائی گئی ہے،

کالج کا کتب خانہ

کالج کے ساتھ بورڈنگ بھی ہے اور اسی وضع کا ہے جیسے قسطنطنیہ کے بڑے بڑے بڑے کالجوں کے بورڈنگ ہیں، کالج کی لائبریری اگرچہ بہت بڑی نہیں ہے لیکن کتابیں نادر اور کمیاب جمع کی گئی ہیں،

جو کتابیں چھپی نہیں اور ان کے قدیم نسخے نہیں مل سکتے، یورپ اور ایشیا کے مشہور کتب خانوں سے ان کی نقل و استنساخ کا انتظام کیا ہے، ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ جو اپنے باب میں بے مثل اور نادر کتاب ہے، میں نے اسی کتب خانہ میں دیکھی، اس کالج میں عربی زبان اور فرنچ کی تعلیم لازمی ہے، باقی زبانیں اختیاری ہیں، چنانچہ ترکی کی ایک، جرمن کی ایک، انگریزی کی پانچ، لاٹین و یونانی کی سات کلاسیں ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ بانیان مدرسہ عموماً عیسائی ہیں اور عیسائی بھی رومن کیتھولک جن میں بہ نسبت اور فرقوں کے تعصب زیادہ ہوتا ہے، تاہم ادب کے نصاب میں قرآن مجید کا انتخاب بھی شامل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہونا ان کو بھی مسلم ہے، علوم جو پڑھائے جاتے ہیں، ان میں فلسفۂ حال و علوم طبیعیہ کے علاوہ موسیقی و تصویر کشی کا فن بھی داخل ہے، طلبہ کی تعداد ۵۰۰ اور ۶۰۰ کے بیچ میں ہے جن میں مسلمان صرف ۸ یا ۱۰ ہیں،

طالب علموں کی تعداد

کالج کی عمارت باوجود اس کے کہ بیروت میں تمام چیزیں نہایت ارزاں ہیں دس لاکھ فرنک میں تیار ہوئی ہے، اور یہ کل رقم پادریوں کی ایک جماعت نے ادا اور مہیا کی ہے،

طبی کالج

اس کالج کے ساتھ میڈیکل (طبی) کالج بھی ہے، لیکن اسکی عمارت کسی قدر فاصلہ پر

ہے، پروفیسر النظون نے ہم کو اس کی بھی سیر کرائی، عمارت نہایت وسیع اور بلند، اور آلات نہایت بیش قیمت اور کثرت سے ہیں، تشریح کے کمرے میں جو بہت لمبا اور وسیع ہے، انسان کے ایک ایک عضو کی تصویر موم کی بنی ہوئی ہے، اور اس خوبی و صفائی سے بتائی ہے کہ نقلی ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا، ایک ایک عضو کے متعلق جس قدر امراض ہیں اسی تعداد کے موافق ہر عضو کے متعدد نمونے ہیں، چنانچہ ایک خانہ میں کم و بیش ۲۰۰ آنکھیں ہیں، کسی میں پھلی ہے، کسی میں ناخنہ ہے، کسی کی پلکیں جھڑ گئی ہیں، میں نے ہندوستان کا کوئی میڈیکل کالج نہیں دیکھا ہے، لیکن مجھ کو کافی یقین ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک کالج بھی اس سے بڑھکر بلکہ اسکی برابر بھی نہ ہوگا،

پروفیسر النظون نے ہمارے لئے جو تکلیف اُٹھائی اور جس توجہ اور اخلاق سے وہ تمام کمروں اور چیزوں کی ہمکو سیر کراتا رہا یہ نہایت ناشکری ہے کہ میں اس موقع پر اس کا دلی شکریہ نہ ادا کروں، معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور مجھ سے ملکر خوش ہوا، چنانچہ اُس ہفتہ میں البشیر کا جو پرچہ نکلا اُس میں ایک اڈیٹوریل نوٹ میرے متعلق تھا، جس کی عبارت یہ ہے،

اجتمعنا فی ھذہ الایام علی حضرۃ العالم الشیخ شبلی النعمانی المعلم الاوّل للعلوم العربیۃ فی بلدۃ علی گڈہ من بلاد الھند فرأینا فیہ رجلا کثیر المعارف وھو جائز النشان المجیدی من الرتبۃ الرابعۃ، اقام فی الاستانۃ العلیۃ مدۃ ۳ شہر وحضر الی بیروت وتوجہ ھذا النھار الی زیارۃ بیت المقدس ثم منہا الی مصر ثم الی بلاد الھند،

جمعیات اور اخبارات

ہماری زبان میں انجمن کا لفظ جس معنی میں بولا جاتا ہے، اس کے مقابل میں یہاں جمعیۃ کا لفظ ہے، مصر وغیرہ میں بھی یہی لفظ مستعمل ہے، انجمنیں یہاں کثرت سے ہیں اور ان کے مقاصد نہایت مفید ہیں، لیکن تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بھی نہیں بعض مشہور انجمنوں کا نقشہ ذیل میں درج ہے، جس سے ان کے مقاصد بھی معلوم ہوں گے،

نام انجمن	مذہب	مقصد	بانی انجمن
مجلس ملی	روم آرتھوڈکس	رفاہ عام	مطران عفرائیل
تعلیم مسیحی	"	مذہبی	"
قدیس پولس پیغمبر رسول	"	"	"
خیریہ	"	اعانت فقراء	خواجہ سلیم
مرضیٰ	"	غریبوں کا معالجہ	خواجہ نجیب
دفن الموتیٰ	"	لاوارث اور غریب اشخاص کی تجہیز وتکفین	خوری یعقوب
زہرۃ الاحسان	"	فن ادب	سیدہ طریقہ
خیریہ	مارونیہ	اعانت فقراء	خواجہ حنا ینہ
دائرۂ علمیہ	"	ترقی علوم	مطران یوسف

نام انجمن	مذہب	مقصد	بانی انجمن
احویہ مار مارون	مارونیہ	فن ادب	سلیم آفندی
یوحنا مار مارون	روم آرتھوڈکس	رفاہ عام	خواجہ جلیل
خیریہ	رومن کیتھولک	اعانتِ فقرار	یشارہ خوری
دیر القسمر	"	"	خواجہ نخلہ
شمس البر	مسیحی	ادب	سلیم آفندی کساب
باکورۃ السوریۃ (یعنی شام کی صبح)	"	"	سیدہ حنہ عتیق
انجیلیۃ	انجیلیۃ	رفاہ عام	خلیل آفندی سرکس

اس فہرست سے ظاہر ہوگا کہ عیسائی مذہب کی جس قدر شاخیں ہیں سب کی الگ الگ انجمنیں ہیں لیکن مسلمانوں نے اس فضول کام کو سرے سے ہاتھ نہیں لگایا ہے

اخبارات و رسالے جو یہاں سے نکلتے ہیں، ان میں البشیر، بیروت، تقدم، ثمرات الفنون، الصبح المنیر، الصفا، لسان الحال، المصباح، الہدیۃ، النشرۃ الاسبوعیہ، حدیقۃ الاخبار زیادہ مشہور ہیں، ان میں بیروت اور ثمرات الفنون کے سوا اور تمام اخباروں کے مالک اور اڈیٹر عیسائی ہیں، چونکہ مطبع کو یہاں آزادی نہیں، اس لئے ان اخبارات میں معمولی خبروں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، البتہ علمی رسالے بڑی آب و تاب سے نکلتے ہیں، اور خصوصاً الصفا اور المقتطف تو اس شان کے پرچے تھے کہ یورپ کے میگزینوں کی برابری کرتے تھے، افسوس ہے کہ الصفا بند ہوگیا اور المقتطف نے اپنا مقام بدل دیا، یعنی اب قاہرہ سے

نکلتا ہے،

رصدخانہ

یہاں ایک مختصر سا رصدخانہ بھی ہے، جس کو پروفیسر فان ڈیک امریکانی نے ۱۸۷۴ء میں قائم کیا تھا، اس میں رصد کے متعلق اکثر ضروری آلات موجود ہیں، ہر روز جو امور رصد سے معلوم ہوتے ہیں، اس کی اطلاع بذریعہ تار کے قسطنطنیہ بھیجی جاتی ہے، اور وہاں سے یورپ وغیرہ میں شائع ہوتی ہے، اس کا اہتمام اب مسٹر رابرٹ کے ہاتھ میں ہے، جو مدرسہ امیرکانیہ میں ریاضیات کا پروفیسر ہے،

عام حالات اور بیروت کے احباب

بیروت کے علما

میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ بیروت میں قیام کرنے کا اصلی سبب شیخ طاہر مغربی سے ملنا تھا، چنانچہ عبدالباسط الانسی کے ذریعہ سے ان سے ملاقات ہوئی اور دیر تک علمی صحبت رہی، دو تین دفعہ اور ملاقاتیں ہوئیں، ایک بار فرودگاہ پر بھی تشریف لائے شیخ موصوف ابھی جوان ہیں، لیکن علم و فضل کی وجہ سے لوگ اُن کی بہت عزت کرتے ہیں، میں نے ان کے کمال کا جس چیز کو جوہر سمجھا اور جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا وہ یہ تھا کہ شیخ موصوف اور علما کی طرح محدود خیال کے آدمی نہیں ہیں، نئے خیالات سے آشنا ہیں، کسی قدر فرنچ بھی جانتے ہیں، فرانس کی سیر کی ہے، قومی ہمدردی کا مادہ ہے، اور مسلمانوں کے تنزل سے بیخبر نہیں ہیں، اگر یہ مذاق ان ممالک کے عام علما میں پیدا ہو جائے، تو ترقی کی واقعی امید ہو سکتی ہے، شیخ موصوف دمشق

کے مدرسہ میں مدرس ہیں، وہ صاحب تصانیف بھی ہیں اور ریاضی کے فن میں انکی بعض تصنیفات چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہیں،

بیروت کے اور علما اور اہلِ کمال سے بھی نیاز حاصل ہوا، میں معمولاً عبدالباسط الانسی کی دوکان پر بیٹھا کرتا تھا، وہاں اکثر اہلِ علم اور اربابِ مناصب آ نکلتے تھے اور ان سے ملاقات و تعارف ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ شہر میں زیادہ چرچا ہوا تو بعض بعض حضرات میری قیامگاہ پر بھی تشریف لائے، ان میں سے شیخ عمر جیلی اور ایک اور صاحب جن کا نام اب یاد نہیں رہا، میرے حال پر نہایت عنایت فرماتے تھے، شیخ عمر جیلی مشہور رسالہ الصفا کے مالک اور مہتمم ہیں، اور نہایت فیاض اور خوش اخلاق ہیں، دوسرے صاحب جو طالب علم ہیں منطق کی تحصیل کی غرض سے تشریف لائے، میں نے تنگیِ وقت کا عذر کیا، تاہم وہ اکثر تشریف لاتے تھے اور فن ادب کے تذکرے رہتے تھے، ایک دن مجھ سے پوچھا کہ متنبی کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا کہ لہ حسنات و سئیات بولے کہ والحسنات یذھبن السیئات مجھ کو ان کا پُرلطف جواب نہایت پسند آیا،

ایک دن عبدالباسط الانسی نے میری دعوت کی اور بیروت کے اکثر مشہور علمار کو مدعو کیا، شیخ عبدالقادر جزائری جو الجزائر کا بادشاہ تھا اور ایک مدت تک فرانس کے ساتھ معرکہ آرا رہا، اس کے بھتیجے شیخ عبدالرحمن الجزائری مدت سے یہاں رہتے ہیں اور سلطان کے ہاں سے وظیفہ پاتے ہیں، وہ بھی تشریف رکھتے تھے نہایت معمر اور صاحبِ علم ہیں، عبدالباسط الانسی کے مکان میں چھوٹا سا خوبصورت پائیں باغ ہے، سب لوگ وہاں بیٹھے، بنچ اور کرسیوں کی نشست تھی،

تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ کھانے کے کمرہ میں گئے، کھانا انگریزی طریقہ پر تھا، یعنی میز اور کرسیاں تھیں اور ایک کھانا ہو چکتا تھا، تو دوسرا لایا جاتا تھا، ایک ڈش کے بعد دوسری ڈش آتی تھی، میں نے شیخ طاہر مغربی سے کہا کہ ہندوستان میں ایسا اتفاق ہوتا تو من تشبہ بقوم کا فتویٰ لگایا جاتا، بولے کہ اُن ممالک میں یہی مناسب ہو کیونکہ وہاں اسلامی حکومت نہیں رہی، اس لئے رسم و رواج اور مذہبی تعصبات کا (گو وہ صحیح نہ ہوں) قائم رکھنا ضرور ہی، تاکہ مذہب کا عام اثر کم نہ ہونے پائے، لیکن اسلامی ممالک میں ان فضول باتوں کی کچھ ضرورت نہیں" یہ صحبت دیر تک رہی، اور بڑے لطف سے گذری، کھانے بھی نہایت لذیذ اور خوشگوار تھے،

چونکہ یہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے میری طبیعت برابر بدمزہ رہی، ایک دن بخار بھی آگیا، عبدالباسط آفندی کے چچیرے بھائی عبدالرحمن الانسی یہاں کے مشہور ڈاکٹروں میں ہیں اور مصر کے مڈیکل کالج میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی ہے، علاج کی غرض سے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے نہایت مہربانی کی اور کہا کہ "آپ جب قیام گاہ پر تشریف لیجائیں گے تو دوا وہیں پہنچ جائیگی" چنانچہ دو گھنٹے کے بعد ایک آدمی دوا کی شیشی لیکر آیا اور کہا کہ اگر اس سے آرام نہ ہو تو ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دیجئے گا، دوا سریع الاثر ہونے کے ساتھ خوش مزہ بھی تھی، بخار اسی دن جاتا رہا، ڈاکٹر صاحب نے اگرچہ یورپ کے طریقہ پر تعلیم پائی ہی لیکن ایشیائی بلکہ اسلامی مہمان پرستی کا اثر اس قدر باقی ہے کہ فیس درکنار دوا کی بھی قیمت لینی گوارا نہ کی،

اس بخار نے بڑا ہرج یہ کیا کہ طرابلس کی سیر مفت میں جاتی رہی، ان دنوں طرابلس کے بعض علماء اتفاق سے وہاں آگئے تھے، ایک صحبت میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان لوگوں نے نہایت اصرار کیا کہ ہمارے ساتھ طرابلس چلو، طرابلس مشہور اسلامی شہر ہے اور بعض اسلامی خصوصیتوں کے لحاظ سے بڑا یادگار مقام خیال کیا جاتا ہے، بیروت سے صرف دو دن کی راہ ہے، کافی وقت تھا کہ میں وہاں جاکر جہاز کی روانگی تک واپس آجاتا میں نے ہر طرح تیاری بھی کر لی تھی، لیکن عین وقت پر بخار آگیا، اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی،

اس سے زیادہ بد قسمتی یہ کہ احباب نے بھی ساتھ چھوڑا، شیخ علی ظبیان جو کئی مہینہ تک انیس و ہمدم رہے تھے، صرف میری وجہ سے بیروت میں مقیم تھے، دمشق سے ان کے والد ماجد کا خط آیا اور ان کو مجبوراً جانا پڑا، رات کے آٹھ بجے روانگی کا وقت تھا، رخصت کے وقت گلے مل کر میرے شانوں کو بوسہ دیتے تھے، (یہاں کا عام دستور ہے) اور یہ شعر پڑھتے تھے،

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیۃ من عرار

یعنی اب نجد کے عرار (ایک پھول کا نام ہے) کی خوشبو سے لطف اٹھانا ہو تو اٹھا لو ورنہ آج کی رات کے بعد پھر عرار نصیب نہیں ہونے کا،

بیروت میں میں نے جس چیز کو نہایت ناپسند کیا، وہ ایک مکان ہے جسکو مغنی کہتے ہیں، یہ نہایت نامہذب اور مخرب اخلاق چیز ہے، اور معلوم نہیں کہ اسلامی حکومت نے اس کو کیونکر جائز رکھا ہے، عین سڑک پر ایک عالیشان دو منزلہ مکان ہے، اوپر کی منزل میں ایک وسیع کمرہ ہے، جس میں ترتیب کے ساتھ

بہت سی کرسیاں بچھی ہیں، صدر کی جانب ایک بلند مستطیل چبوترہ ہے، بہت سی یورومین لیڈیاں اس پر بیٹھ کر گاتی بجاتی ہیں، ایک دور ختم ہو جاتا ہے، تو لیڈیاں چبوترے سے اتر کر کمرہ میں ٹہلتی ہیں اور معشوقانہ انداز کے ساتھ تماشائیوں کے پاس سے گذرتی ہیں، جس کو منظور ہوتا ہے، اشارہ سے ان کو بلاتا ہے، اور وہ بڑے ناز و انداز سے اس کے پہلو میں آکر بیٹھ جاتی ہیں، نہایت بیحیائی اور بے شرمی کے ساتھ اختلاط شروع ہوتا ہے، شراب کا دور چلتا ہے، ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر ٹہلتے ہیں، معانقہ، بوس و کنار غرض بیحیائی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے، نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیأت اعمالنا،

بیروت سے روانگی

بیروت میں میری طبیعت یوں ہی بدمزہ تھی، شیخ علی ظبیان اور شیخ طاہر مغربی کے چلے جانے کے بعد اور بھی وحشت ہوئی، لیکن جہاز کے انتظار میں چار و ناچار دو تین روز ٹھہرنا پڑا، ۸ صفر ۱۳۱۱ھ کو شام کے وقت بیروت سے روانہ ہوا، شیخ عبد الباسط اور شیخ عمر جیلی بندرگاہ تک ساتھ آئے، اور انہی کے ذریعہ سے اسباب وغیرہ کے انتظام میں نہایت آسانی ہوئی، دوسرے دن جہاز یافہ پہنچا، جہاز لنگر کرنے کے ساتھ ملاحوں اور قلیوں کا حملہ ہوا اور اس قدر شور و غل اور ابتری پیدا ہو گئی کہ میرے حواس جاتے رہے، میرا اسباب ہر چند مختصر تھا، تاہم اسکے بھی حصے بخرے کر لئے گئے، اور جس ملاح کو جس قدر ہاتھ لگا لے کر چلتا ہوا، اور اپنی کشتی میں جا کر رکھ آیا، میں حیران تھا کہ خود کہاں جاؤں، آخر تن بتقدیر ایک کشتی

میں بیٹھ گیا، کنارے پر پہنچکر دیر تک اس کشتی کا انتظار کرنا پڑا، جس میں بقیہ اسباب تھا، یہ مرحلہ طے ہوا تو آگے پروانہ راہداری اور معائنۂ اسباب کی مصیبت کا سامنا تھا، بارے بہزار خرابی دوپہر تک ان جھگڑوں سے نجات ملی، اور نمازِ ظہر کے قریب شہر میں پہنچا،

یافہ جس کو انگریزی میں جافا کہتے ہیں، نہایت قدیم شہر ہے، توریت میں اسکا ذکر ہے اور مورخ بلینی کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھا، ۱۳ھ میں کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا عہد تھا، اسلام کے قبضہ میں آیا، چونکہ یہ شہر بیت المقدس کا اسٹیشن ہے یعنی یہیں سے بیت المقدس جاتے ہیں، اس لئے ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں کی کثرت سے آمد و رفت رہتی ہے، شہر کا وہ حصہ جس کو یوروپین آبادی کہا جاسکتا ہے، خوبصورت اور پُر فضا ہے،

میوہ جات یہاں کثرت سے ہوتے ہیں، انار نہایت عمدہ ہوتا ہے، اور بہت سستا آتا ہے، ایک بڑی خصوصیت اس شہر کی یہ ہے کہ شہر کے باہر باغوں کا ایک سلسلہ ہے اور متصل دو تین میل تک چلا گیا ہے، بیت المقدس یہاں سے ۳۶ میل ہے، اب تو ریل جاری ہو گئی ہے، لیکن اس وقت سے تنکرم چلتی تھی، میں مغرب کے وقت سوار ہوا، راہ میں بعض مشہور مقامات (رملہ وغیرہ) آئے لیکن رات کی وجہ سے میں کچھ دیکھ نہ سکا،

صبح ہوتے ہوتے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آیا جو برابر بلند ہوتا چلا گیا ہے، سڑک اگرچہ بڑے پیچ و پیچ سے چکر کھاتی ہوئی گئی ہے، لیکن نہایت صاف اور ہموار ہے، پہاڑ کا دامن بالکل سرسبز و شاداب ہے، اور عجیب لطف و فضا کا مقام ہے، جا بجا عرب بدوؤں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں، مکانات اگرچہ تنگ

و مختصر ہیں، لیکن بالکل سفید پتھر کے ہیں، سبزہ زار میں یہ سپیدی نہایت خوشنما معلوم
ہوتی ہے، یہ سلسلہ دس بارہ میل چل کر ختم ہوا، اور بیت المقدس کی آبادی نظر پڑی
بیت المقدس پہاڑ پر آباد ہے، میں ایک ہفتہ یہاں رہا، اور مسجد اقصیٰ اور قمامہ
وغیرہ کی سیر کی، گاڑی سے اُتر کر میں سیدھا عبد الرزاق آفندی کے مکان پر گیا،
اُنھوں نے بے اعتنائی کی (یہ واقعہ کتاب کے خاتمہ میں تفصیل کے ساتھ آئیگا) تو
ہوٹل میں جانے کا قصد کیا، راہ میں ہندیوں کا زاویہ تھا، میں نے خیال کیا کہ یہاں
کے لوگوں سے ملنا مفید ہوگا، چنانچہ زاویہ میں داخل ہوا تو پہلے شیخ زاویہ کا
سامنا ہوا، یہ شیخ رامپور کے رہنے والے ہیں اور ایک مدت سے یہاں رہتے
ہیں، بیچارے کچھ پڑھے لکھے نہیں، نہایت معقول اور منتظم آدمی ہیں، زاویہ کو نہایت
خوش سلیقگی سے درست کیا ہے، ایک کمرہ جو ملاقاتیوں کے لئے مخصوص ہے معقول
طور پر آراستہ ہے، صحن میں پھولوں کی کیاریاں ہیں، سلام علیک اور مزاج پرسی
کے بعد باتوں باتوں میں جب اُن کو معلوم ہوا کہ میں ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا ہوں
تو اُنھوں نے کہا کہ تم کو یہاں مفتی صاحب اور دیگر اہلِ علم سے ملنا ہے، وہ
ہوٹل میں ٹھہرنا معیوب خیال کرتے ہیں، چنانچہ زاویہ ہی میں ٹھہرا لیکن زاویہ
کا کھانا اس خیال سے نہیں کھاتا تھا کہ وہ فقرا اور محتاجوں کے لئے مخصوص ہے

———— ⁂ ————

بیت المقدس، مسجد اقصٰی، قمامہ

بیت المقدس کسی خاص عمارت کا نام نہیں، بلکہ شہر کا نام ہے لیکن یہاں زیادہ تر قدس کہتے ہیں، یہ متبرک شہر اگرچہ حضرت داؤد و سلیمانؑ کے انتساب سے شہرت رکھتا ہے، اور گویا اس کے وجود کی تاریخ انہی انبیا کے عہد سے شروع ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ اس عہد سے بہت پہلے موجود تھا، حضرت عیسیٰؑ سے ۱۰۴۸ برس پہلے حضرت داؤدؑ نے اس کو یبوسیوں سے چھینا اور اپنا پایہ تخت قرار دیا، اس عہد سے آج تک وہ بڑے بڑے تاریخی واقعات کا مرکز رہا ہے، شروع اسلام میں مسلمانوں کا قبلہ تھا اور عیسائیوں کا آج بھی ہے،

موجودہ شہر کی آبادی پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں، مکانات اور عمارتیں معمولی درجہ کی ہیں، سڑکیں بھی چنداں وسیع نہیں ہیں، اور چونکہ اکثر جگہ مسقف بازار ہیں، اس لئے زیادہ تنگی اور تاریکی ہے، شہر کے گرد پتھر کی شہر پناہ ہے جو سلطان سلیمان اعظم نے ۱۵۴۳ء میں تیار کرائی تھی، یہ حالت قدیم شہر کی ہے لیکن جدید آبادی نہایت پُرفضا اور پُررونق ہے، سڑک نہایت وسیع اور دونوں طرف عمارتیں ہیں، بنگلے اور کوٹھیاں کثرت سے ہیں اور احاطہ عموماً وسیع اور سبزہ و چمن بندی سے آراستہ ہیں، تمام شہر کی زبان اور وضع و لباس عربی ہے، قسطنطنیہ کی طرح یہاں بہت سے زاویے اور تکیے ہیں، ہر قوم اور ملک کے لئے

الگ الگ زاویہ ہے اور مسافروں کو کھانا اور قہوہ مفت ملتا ہے،

آب وہوا نہایت عمدہ ہے، میں اگست کے آغاز میں پہنچا تھا، تاہم دن کو گلابی جاڑا ہوتا تھا، اور رات کو اچھی خاصی سردی پڑتی تھی، میوے کثرت سے اور نہایت شیریں ولذیذ ہوتے ہیں، اس وقت انگور کا آغاز تھا، جس طرح ہمارے یہاں صبح کے وقت بھٹے، گاجریں وغیرہ ٹوکروں میں بھر بھر کر بازار میں لاتے ہیں اور دور تک ڈھیر لگ جاتا ہے، بعینہ یہی حالت یہاں انگوروں کی ہے، میرا تمام دن یہ مشغلہ رہتا تھا کہ انگور کے دانے ٹونگا کرتا تھا،

مسجد اقصیٰ

یہ وہ مبارک مسجد ہے، جس کی بنا حضرت داوٗدؑ نے ڈالی اور حضرت سلیمانؑ نے انجام کو پہنچایا، مسجد کا احاطہ جس کو حرم کہتے ہیں، نہایت وسیع ہے، لیکن زیادہ تر ناہموار اور غیر مسطح ہے، اور اکثر جگہ خودرو گھاس اور جھاڑیاں ہیں، میں نے لوگوں سے اس کا سبب دریافت کیا، معلوم ہوا کہ سلطان نے کئی دفعہ اس کی مرمت اور درستی کے لئے رقم بھیجی، لیکن کارپردازوں اور مجاوروں نے اس کا بہت کم حصہ صرف کیا، طرہ یہ کہ میں نے خود مجاوروں سے پوچھا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ "ہاں کچھ رقم مجاوروں کے تصرف میں بھی آتی ہے، اور کیوں نہ آئے، باورچی کھانا پکاتا ہے تو نمک خواہ مخواہ چکھ لیتا ہے،

مسجد کی عمارت جس کا طول (۰۰۰) گز اور عرض (۰۰۰) گز ہے نہایت خوبصورت پُرتکلف اور شاندار ہے، چھت ستونوں پر ہے اور (۰۰۰) صرف سنگ رخام کے

کے ستون ہیں، جا بجا پچی کاری اور طلائی کام ہے، یہ عمارت جس قدر ہے عبد الملک
ابن مروان کی بنوائی ہے، البتہ بنیادوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے
عہد کی ہیں، بائیں جانب عمارت اور کسی قدر فاصلہ پر ایک وسیع تہ خانہ ہے، دس بارہ
سیڑھیاں اُتر کر مسطح زمین ملتی ہے، یہاں نہایت عالیشان محرابوں کی سات قطاریں
ہیں، محرابوں کے ستون نہایت چوڑے اور بلند ہیں، مجاورین ان محرابوں کو حضرت
سلیمانؑ کے عہد کی تعمیر بتاتے ہیں، اور اس قدر تو یقینی ہے کہ اسلام کے قبل کی ہیں،

حرم مسجد میں اور بہت سے متبرک مقامات ہیں، مثلاً قبۃ السلسلہ، قبۃ المعراج،
قبۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، لیکن سب میں زیادہ پُرشان قبۃ الصخرہ ہے، یہاں
وہ پتھر رکھا ہوا ہے، جس کی نسبت عوام میں مشہور ہے کہ آسمان و زمین کے بیچ میں معلق ہے
اور قیامت کے دن عرش مجید اسی پر رکھا جائیگا، اہل عرب اسکو صخرہ اور ہمارے ملک کے
عوام "تخت رب العٰلمین" کہتے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ پتھر نہایت قدیم زمانہ کا ہے،
اور ہر زمانہ میں اسکی نہایت عظمت کی گئی ہے، عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ
علیہ السلام نے اس پر قدم رکھا تھا، چنانچہ سلطان صلاح الدین کے عہد سے پہلے جب
اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تھا تو اُنھوں نے اپنے خیال کے موافق اس نشان پر سونے
کا قبہ بنایا تھا، مسلمان بھی اس کی نہایت عزت کرتے ہیں، لیکن مجھ کو معلوم نہیں کہ کسی
صحیح حدیث میں بھی اسکی کوئی فضیلت مذکور ہے،

بہر نوع قبہ کی صورت ہے کہ ایک بلند چبوترہ پر مثمن برج ہے، جس کی بلندی
کم و بیش (۱۰۰) فٹ ہے چھت اور دیواروں پر نہایت عمدہ لاجوردی اور طلائی
کام ہے، اور باوجودیکہ مدتوں کا بنا ہے، تاہم اس قدر روشنی اور چمک ہے کہ نگاہ نہیں

ٹھرتی، مختصر یہ کہ زیب وزینت کے لحاظ سے علامہ بشاری کا یہ دعویٰ چنداں بیجا نہیں کہ
"تمام ممالکِ اسلامیہ میں میں نے ایسی خوبصورت اور پر تکلف کوئی عمارت نہیں دیکھی"!
چند سیڑھیوں سے اُتر کر غار میں داخل ہوتے ہیں، یہاں وہ مقدس پتھر رکھا ہوا ہے، غار
اس قدر وسیع ہے کہ ساٹھ ستر آدمیوں کی بخوبی گنجائش ہے، صخرہ زمین سے دو قدِ آدم
بلند ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے وہ بالکل ہوا میں معلق تھا، ممکن ہے کہ اس
زمانہ میں ایسا ہی ہو، لیکن موجودہ حالت یہ ہے کہ ایک مدور دیوار ہے اور صخرہ اس پر
اس طرح رکھا ہوا ہے کہ دیوار کی چھت بن گیا ہے، مجاورین کا بیان ہے کہ صخرہ کو ہوا
میں معلق دیکھ کر لوگ اس کے نیچے جاتے ہوئے ڈرتے تھے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک
عورت کا اسقاط حمل ہوگیا، یہ واقعہ شیخ محی الدین اکبر کے عہد میں ہوا تھا، شیخ موصوف
نے اس کے گرد دیوار کھنچوا دی کہ بظاہر معلق نہ معلوم ہو" مجاورین یہ بھی کہتے ہیں کہ دیوار
اس قدر بودی اور اندر سے کھوکھلی ہے کہ کسی طرح صخرہ کا بار نہیں اُٹھا سکتی، چنانچہ
ایک مجاور نے میرے سامنے دیوار کو انگلی سے کھٹ کھٹایا اور کھن کھن آواز نکلی،

یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس میں شبہہ نہیں کہ یہ مقام مدت تک انبیاے کرام
کا مسکن اور وحی والہام کا مہبط رہا ہے، اس لئے آیات اور تجلیاتِ الٰہی کے جس قدر
آثار یہاں موجود ہیں محلِ تعجب نہیں، بیت المقدس اور اس کے قرب وجوار میں اور بھی
بہت سی زیارت گاہیں ہیں، مثلاً بیت اللحم، جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام تولد ہوئے
تھے، مقام خلیل، جہاں حضرت ابراہیمؑ وحضرت یعقوبؑ وحضرت اسحٰقؑ کی قبریں ہیں،
وادی جہنم جہاں حضرت مریمؑ مدفون ہیں، لیکن افسوس ہے کہ بعض اتفاقات کی وجہ سے
میں ان مقامات کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا، مقامِ خلیل کے لئے جو بیت المقدس

سے پندرہ بیس میل ہے، میں نے دو تین روز برابر کوشش کی، لیکن ان دنوں یہودیوں کا کوئی تیوہار تھا، اس لئے سواریاں بالکل ناپید تھیں اور ملتی بھی تھیں تو چوگنے کرایہ پر ملتی تھیں

قمامہ

یہ وہی قیامت زا مقام ہے، جس کے لئے ایک زمانہ میں تمام یورپ امنڈ آیا تھا، اور مدتوں یہ طوفان برپا رہا تھا، یہ ایک نہایت وسیع گرجا ہے اور عیسائیوں کے اعتقاد کے موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی مقام میں مصلوب و مدفون ہوئے اور یہیں سے آسمان پر گئے، اس مکان کا اہتمام و انتظام اگرچہ عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن چونکہ ترکی حکومت میں واقع ہے اور چھ لاکھ اہل یورپ کے مقابلہ میں صلاح الدین کی معرکہ آرائیوں کی یادگار ہے، اس لئے اس کا بوّاب یعنی کلید بردار مسلمان ہے، چنانچہ میں جب اس گرجا میں گیا تو اسی کی رہبری سے تمام مقامات کی سیر کی،

مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ہر طرف بڑے بڑے رہبان اور قسیس نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف ہیں، بواب پہلے مجھ کو اس مقام پر لے گیا، جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام (عیسائیوں کے اعتقاد کے موافق) آسمان پر گئے، یہ ایک مختصر سا حجرہ ہے، صدر کی جانب چبوترے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مورت ہے، تمام بدن بجز ستر عورت کے برہنہ ہے، صورت سے کسی قسم کے تقدس اور شانِ نبوت کا اظہار نہیں ہوتا، میں جب اس حجرہ میں گیا، تو شمع روشن تھی اور ایک بڑا امیشتن یادری تصویر کی طرف ٹکٹکی باندھے مراقبہ میں مصروف تھا،

مراقبہ سے فارغ ہو چکا تو مجاور نے اس کے سر پر تھوڑا سا پانی چھڑکا جس کو اُس نے
بڑے ادب اور خشوع سے اپنے چہرہ اور داڑھی پر مل لیا،

صلیب دیئے جانے کی جگہ بھی شان و شوکت کی ہے، لیکن اسکو دیکھ کر عیسائیوں
کی سادہ لوحی پر سخت افسوس آتا ہی،

ایک بلند مستطیل چبوترہ پر جو سرتاپا سنگِ مرمر کا ہے، صلیب کھڑی ہی، حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی ہتھیلیوں میں آہنی کیلیں ٹھکی ہیں، پاؤں کو اوپر تلے لکڑی پر رکھکر
اس طرح میخ ٹھونک دی ہی کہ پاؤں کو توڑ کر لکڑی میں نکل گئی ہے، اسی کے قریب
ایک طرف حضرت مریمؑ نہایت غمگین کھڑی ہیں، حضرت مریمؑ کا مجسمہ یعنی اسٹیچو نہایت
شاندار ہے، سونے کی مورت ہے اور لباس کی ساتھ بنائی گئی ہے، لباس پیشواز
کے مشابہ ہے، اس مقام پر بڑے بڑے رہبان اور قسیسوں کا مجمع تھا، راہبہ عورتیں
بڑے خضوع و خشوع سے صلیب کی طرف ٹکٹکی باندھے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں،
مذہبی خیالات بھی کیا ہی عجیب چیز ہیں!!!

علما و فضلا کی ملاقات اور بعض دیگر حالات

بیت المقدس کے مشہور اور نامور عالم سید طاہر ہیں جو مفتی شہر ہیں اور مفتی
ہی کے نام سے مشہور ہیں، چونکہ قسطنطنیہ میں میں نے انکی تعریف سنی تھی، اسلئے بیت المقدس
پہنچکر سب سے پہلے انہی کی ملاقات کا قصد کیا، جوں ہی میں کمرہ میں داخل ہوا مفتی صاحب
اور تمام حاضرین تعظیم کو اٹھے (یہ طریقہ یہاں عام ہے اور ہر شخص کے لئے برتا جاتا ہی)
مزاج پرسی اور مختصر حالات پوچھنے کے بعد ایک صاحب نے فرمایا کہ لعل حضرتکم

من العلماء یعنی غالباً آپ علما میں سے ہیں، میں نے کہا کہ لا و لکن من طلاب العلم یعنی عالم تو نہیں البتہ طالب علم ہوں، وہ پہلے سے ایک علمی مسئلہ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور میرے پہنچنے کی وجہ سے ان کی صحبت برہم ہو گئی تھی، جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں بھی کچھ پڑھا لکھا ہوں تو ایک صاحب نے نہایت تہذیب اور معقولیت سے کہا کہ ہم لوگ ابھی ایک مسئلہ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، اگر آپ پسند فرمائیں تو وہ مسئلہ آپ کے سامنے بھی پیش کیا جائے،، انکے خاص الفاظ یہ تھے یا حضرۃ الشیخ قد کنا قبل ذلک فی بحث فلو اجبتم عرضنا علیکم غرض اُنھوں نے وہ مسئلہ بیان کیا اور وہ یہ تھا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں کہ الم تر کیف فعل ربک بعاد ذات العماد خدا نے آنحضرت صلعم کو مخاطب کر کے کہا کہ تو نے یہ واقعہ نہیں دیکھا، حالانکہ یہ واقعہ آنحضرت صلعم کی ولادت سے سینکڑوں برس پہلے واقع ہوا تھا، میں نے کہا کہ رویت کا اطلاق علم یقینی پر بھی ہوتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے الم تر کیف ربک باصحاب الفیل، عرب جاہلیہ کے اشعار میں بھی یہ اطلاق جابجا موجود ہے، ایک صاحب نے میری تقریر پر اعتراض کرنا چاہا، لیکن مفتی صاحب نے کہا یہ جواب بالکل صحیح ہے، اور اس میں جائے گفتگو نہیں، میں جب تک بیت المقدس میں رہا قریباً ہر روز اس پُرلطف صحبت میں شریک ہوتا رہا،

مفتی صاحب تقدس اور شریفانہ اخلاق کی مجسم تصویر ہیں، اور اسی کا اثر ہے کہ تمام شہر ان کی نہایت عزت کرتا ہے، انکی تنخواہ کل تین سو قرش ہے، یعنی پینتیس ۳۵ روپے لیکن شہر میں ان کا جو اثر ہے وہ حاکم شہر کا بھی نہیں، بڑی خوبی یہ ہے کہ اگرچہ پرانے زمانہ کے آدمی ہیں اور نہایت متقدس ہیں تاہم آزادخیال ہیں اور مذاق حال سے آشنا ہیں،

لطیفہ، ان ممالک میں علماء کو عمامہ یا ٹوپی پر ایک سفید دھجی جس کو لفہ کہتے ہیں

پہننا ضروری امر ہے، میں جس دن قمامہ کی سیر کو گیا میرے سر پر صرف ٹوپی تھی، عمامہ نہ تھا،
راہ میں جا رہا تھا کہ ایک صاحب نے جو روشناس ہو گئے تھے دیکھ لیا اور مفتی صاحب کے
جلسہ میں اس کا تذکرہ کیا، چونکہ وہاں کی رسم کے موافق یہ بالکل نئی بات تھی، لوگوں میں
اس کے چرچے ہوئے، یہاں تک کہ دوسرے دن جب میں مفتی صاحب کے دربار میں گیا تو
ایک صاحب نے بڑے تعجب اور حیرت سے پوچھا کہ سمعنا ان حضرۃ الشیخ خرج من
غیر لفتہ یعنی ہم نے سنا کہ جناب والا عمامہ ولفہ کے بغیر بازار میں نکلے،" میں نے کہا ہاں
میں عیسائیوں کے گرجہ میں گیا تھا اور ایسے مقامات کے لئے عالمانہ لباس موزوں نہیں ہے
سب بول اُٹھے کہ واللہ قد اصبتم یعنی آپ نے بالکل بجا کیا،

ایک دن میں بخارا والوں کے زاویہ میں گیا، اتفاق یہ کہ اسی دن بخارا کے چند
رئیس اور معزز لوگ حج سے پھر کر بیت المقدس کی زیارت کو آئے تھے، شیخ زاویہ
نے مجھ کو ان لوگوں سے ملایا، صورت اور وضع سے دولت مند اور محترم اور موقر معلوم
ہوتے تھے، بعض صاحب علم اور فقیہ تھے، چونکہ یہ لوگ روس کی حکومت میں رہتے ہیں،
میں ان سے روسی گورنمنٹ کے متعلق گفتگو کرتا رہا، بہت شکایت کرتے تھے، اور
زیادہ اس بات کے شاکی تھے کہ مسلمان بجبر فوج میں داخل کئے جاتے ہیں اور کسی
اسلامی حکومت سے جنگ پیش آتی ہے، تو مسلمانوں کو اپنے ہی ہم مذہبوں سے مقابلہ
کرنا پڑتا ہے،

بیت المقدس سے روانگی

بیت المقدس سے روانہ ہو کر میں یافہ میں آیا اور وہاں سے جہاز میں سوار ہو کر تیسرے دن اسکندریہ پہنچا، جہاز کا لنگر کرنا تھا، کہ قلیوں اور ملاحوں کی مصیبت کا سامنا ہوا، یہ آفت یوں تو ہر جگہ ہے، لیکن اسکندریہ کو اس خصوصیت میں تمام مقامات پر ترجیح ہے، بہزار خرابی کنارے پر پہنچا، وہاں قلیوں کا ہجوم تھا، اور ایک ایک مسافر پر چار چار گرے پڑتے تھے، ایک قلی نے زبردستی میرا اسباب اُٹھا لیا، مجبوراً میں اس کے ساتھ ہو لیا، اسکندریہ نہایت قدیم زمانہ کی یادگار ہے، اور اس لحاظ سے اسکی سیر ضروری تھی، لیکن مجھ کو قاہرہ جانے کی جلدی تھی، اس لئے میں نے اُسی وقت گاڑی کرایہ کی اور اسٹیشن پہنچا لطف یہ کہ قلی صاحب بھی گاڑی پر بیٹھ لئے اور میرے پہلو میں بیٹھے، میری کیا مجال تھی کہ اُن کی اس جسارت پر معترض ہوتا،

دریا کے کنارے سے اسٹیشن تک شہر کا جو حصہ نظر سے گذرا نہایت آباد اور پُر رونق تھا، سڑکیں وسیع اور دونوں طرف نہایت بلند مکانات اور دوکانیں تھیں، اسٹیشن پر پہنچکر معلوم ہوا کہ ابھی دو تین گھنٹے کی دیر ہے، میں نے کہا لاؤ جب تک ادھر اودھر پھر آؤں، پاس ہی ایک جامع مسجد تھی، وہاں گیا، نہایت شاندار اور خوبصورت ہے، وضو کرنے کا حوض وسیع اور خوشنما ہے، گرد، استنجا خانے اور پاخانے ہیں لیکن صفائی کا اسقدر اہتمام ہے کہ بو اور رائحہ کا نام تک نہیں،

دس بجے ٹرین روانہ ہوئی، یہاں کی گاڑیوں میں بجائے بنچوں کے آہنی کرسیاں

ہوتی ہیں اور دو دو اس طرح ساتھ جڑی ہوتی ہیں کہ دونوں کی پشت ملی ہوتی ہے، ہر درجہ میں آٹھ آدمیوں کی نشست ہوتی ہے، چار ایک طرف، چار ایک طرف، سونے کی کوئی تدبیر نہیں، رفعِ حاجت کا بھی بندوبست نہیں، دریافت سے معلوم ہوا کہ یورپ میں بھی اسی قسم کی گاڑیاں ہیں، البتہ ایک بات نئی ہے اور آرام سے خالی نہیں، وہ یہ کہ گاڑی ہی میں خوانچے والے جو بسکٹ ڈبل روٹی، پنیر اور میوہ بیچتے ہیں، ہر وقت موجود رہتے ہیں اور چونکہ تمام گاڑیوں میں اس سرے سے اُس سرے تک آمدورفت ہو سکتی ہے خوانچہ والا ہر وقت پھرتا رہتا ہے اور تمام گاڑیوں میں چکر لگاتا ہے،

سید صاحب نے اپنے سفرنامہ میں یہاں کی ریل کے کارخانے، سڑک اسٹیشن، لالٹین، غرض ہر ایک چیز کی نسبت بے سلیقگی اور میلے پن کی سخت ہجو کی ہے، اس وقت یہی حالت ہو گی، لیکن اب یہ شکایت نہیں ہو سکتی ہیں نے اسکندریہ سے قاہرہ اور قاہرہ سے اسمٰعیلیہ تک ریل میں سفر کیا، میرے نزدیک کوئی چیز قابلِ اعتراض نہ تھی،

اس سفر میں جس قدر حصہ مصر کا میری نظر سے گذرا عجیب، سرسبز و شاداب تھا، جہاں تک نگاہ جاتی تھی نہایت سرسبز کھیتیاں نظر آتی تھیں، اسکندریہ سے قاہرہ تک جس قسم کی عمدہ پیداوار نظر آئی میں نے ہندوستان میں پچاس ایکڑ زمین بھی ایسی نہیں دیکھی، ریل شام کے قریب قاہرہ پہنچی اور میں نے جامع ازہر کے قریب ایک لوکانڈہ (ہوٹل) میں قیام کیا،

بیروت میں عبدالباسط آفندی نے مجھ کو ایک خط دیا تھا کہ قاہرہ پہنچکر شیخ عبد الحلیم کے پاس بھجوا دینا، شیخ عبدالحلیم، عبدالباسط آفندی کے چچیرے بھائی ہیں اور جامع ازہر میں پڑھتے ہیں، میں نے وہ خط ان کے پاس بھجوا دیا، وہ دوسرے دن ہوٹل میں

تشریف لائے اور کہا کہ "اگر آپ کو یہاں کے علمی حالات دریافت کرنے ہیں اور علما اور شیوخ سے ملنا ہے تو ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہیں، یہاں علمار اس کو بہت معیوب سمجھتے ہیں" چنانچہ ان کی ہدایت کے موافق میں جامع ازہر میں گیا، اور انھوں نے رواق الشامیین میں ایک پُر فضا حجرہ میرے لئے خالی کرا دیا، ایک مہینہ سے زیادہ میں یہاں مقیم رہا، شیخ عبد الحلیم قریبًا ہر وقت میرے پاس رہتے تھے، اور میری تمام ضرورتوں کو انجام دیتے تھے، وہ میرے رہنما انیس مُعرّف، اور اگر گستاخی نہ ہو تو نوکر اور خادم بھی تھے اور نوکر بھی بے تنخواہ بے غرض،

قاہرہ کا اجمالی حال

یہ شہر مصر کا دار السلطنت ہے، بلکہ حال کے محاورہ میں مصر کا لفظ جب استعمال کیا جاتا ہے تو یہی شہر مراد ہوتا ہے، جوہر سپہ سالارِ فاطمین نے ۳۵۸ھ میں اسکو آباد کرایا تھا، اور اس عہد سے آج تک اس کو روز افزوں ترقی ہی، موجودہ مردم شماری ۸۳۰۴ ، ۳ ہے، سڑکیں وسیع اور مکانات عمومًا بلند اور خوش فضا ہیں، میں جب اس کے وسیع اور پُر رونق بازاروں میں سیر کرتا پھرتا تھا تو بمبئی کا دھوکا ہوتا تھا، قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں اور بڑی تفریح اور آرام کی چیز ہیں لباس اور وضع یہاں کی نہایت بھونڈی اور ناموزوں ہے، عوام نیلگوں لمبا کرتہ پہنتے ہیں، جس کا چاک کھلا رہتا ہے، پاجامہ تہمد وغیرہ بالکل نہیں پہنتے، خواص قفطان اور عبا پہنتے ہیں لیکن چونکہ عبا میں کالر نہیں ہوتا، گردن کھلی رہتی ہی، اور بدنما معلوم ہوتی ہی، نئے تعلیم یافتہ کوٹ پتلون کا استعمال کرتے ہیں، اور یہ طریقہ روز بروز زیادہ مقبول ہوتا جاتا ہے

عورتوں کی وضع اور لباس اس قدر بے ہودہ اور بدنما ہے کہ اس سے زیادہ قیاس میں نہیں آسکتا، عام عورتیں تو وہی نیلگوں لمبا کرتہ پہنتی ہیں، لیکن دولت مند اور نئے فیشن کی بیگمات جن کا لباس بالکل یوروپین ہوتا ہے، وہ بھی ایک بدنما نیلگوں برقع اوڑھ کر بیجا یا ہوّا بن جاتی ہیں، برقع میں ناک کی جڑ سے سینہ تک ایک سادہ دھجی سونڈ کی طرح لٹکتی رہتی ہے، اس دھجی کے اٹکانے کے لئے سونے یا پیتل کی ایک گلی ہوتی ہے جو پیشانی پر لٹکتی رہتی ہے اور بجائے زیور کے استعمال کیجاتی ہے،

عام آدمیوں کے اخلاق میں دناءت زیادہ پائی جاتی ہے معمولی سے معمولی چیز کی قیمت چکانے میں حضرت امام حسین علیہ السلام یا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا واسطہ دلایا جاتا ہے، مرد اور عورت بکثرت بھیک مانگتے ہیں، اور بلا کی طرح لپٹ جاتے ہیں،

موسم کے لحاظ سے یہ ملک ہمارے ہندوستان کے مشابہ بلکہ اس سے بدتر ہے، کچھ عجیب طرح کی گرمی پڑتی ہے، طبیعت ہر وقت مضحل اور سست رہتی ہے، اور کسی کام کے کرنے کو جی نہیں چاہتا، مجھ کو خیال تھا کہ میں یہاں بہت کام کرسکوں گا اور اسی وجہ سے بیروت و بیت المقدس میں کم قیام کیا تھا کہ یہاں زیادہ دنوں تک رہ سکوں، لیکن گرمی نے وہ تمام منصوبے غلط کر دیئے، صبح کے وقت گھنٹہ دو گھنٹہ کام کرتا تھا باقی تمام دن حجرہ میں بیکار پڑا رہتا تھا،

مصر

میں

تعلیم کی حالت

ممالکِ اسلامیہ میں جو مقامات آج کل تعلیم کے مرکز خیال کئے جاتے ہیں قسطنطنیہ اور قاہرہ ہیں، اسی لحاظ سے میں نے ان دونوں مقاموں کی تعلیمی حالت دریافت کرنے میں بہت کچھ کوشش کی، قسطنطنیہ کی طرح یہاں بھی سررشتۂ تعلیم کے عہدہ داروں سے ملا، سالانہ رپورٹیں پڑھیں، متعدد کالجوں کے پروگرام دیکھے، بڑے بڑے کالجوں میں خود جاکر اساتذہ کا طریق درس دیکھا، ان تحقیقات سے جو باتیں معلوم ہوئیں ان کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس موقع پر یہ کہنا بھی ضرور ہے کہ اگرچہ قسطنطنیہ میں تعلیم کو جو وسعت اور ترقی حاصل ہے مصر اور قاہرہ کو اس سے کچھ نسبت نہیں، تاہم مصر کو اس بات میں ترجیح حاصل ہے کہ یہاں سررشتۂ تعلیم کے کاغذات جو عام طور پر شائع ہوتے ہیں، زیادہ مرتب اور مفصل ہیں، اس لئے میں قسطنطنیہ کی بہ نسبت یہاں کی تعلیمی حالت زیادہ تفصیل اور تحقیق کے ساتھ لکھ سکوں گا،

قسطنطنیہ کی طرح یہاں بھی تعلیم کے دو طریقے ہیں، قدیم و جدید، یہ دونوں طریقے بالکل مختلف ہیں، اور اس اختلاف نے دونوں کو نہایت سخت نقصان پہنچایا ہے، قدیم تعلیم جو ہزار برس پیشتر کی تعلیم کا بگڑا ہوا خاکہ ہے، ملک کی آب و ہوا میں بہت سرا

کر گئی ہے اور چونکہ وہ مذہب کے پیرایہ میں ہے، سلطنت کا اثر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اسی کا نتیجہ ہے کہ مصر میں اگرچہ ایک مدت سے جدید تعلیم کی بنیاد پڑ چکی ہے، اور خود گورنمنٹ نے اس کو خاص اپنے سایۂ عاطفت میں لیا ہے، بہت سے لڑکوں کو وظیفہ دیا جاتا ہے اور فیصدی ۴۱ سے کچھ فیس نہیں لی جاتی، تمام بڑے بڑے عہدے صرف نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو ملتے ہیں، یہ سب کچھ ہے، تاہم وسعتِ تعلیم کا یہ حال ہے کہ شہر و اطراف کے تمام چھوٹے بڑے اسکولوں اور کالجوں کو ملا کر طالب علموں کی تعداد دس ہزار بھی نہیں ہے، حالانکہ قدیم طریقہ پر تعلیم پانے والے صرف جامع ازہر میں دس ہزار سے زائد ہیں، اس قدر ضرور ہے کہ جدید تعلیم کا ہر قدم آگے ہے اور قدیم طریقہ کا زور روز بروز گھٹتا جاتا ہے، سرکاری مدرسوں میں ہر قسم کے طلبہ کی تعداد جو ہر سال بڑھتی جاتی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۷ء میں بورڈروں کی تعداد فیصدی ۴۷ تھی، اور ۱۸۸۸ء میں ۵۶ ہو گئی، اسی طرح غیر بورڈر ۱۸۸۷ء میں ۷۱ فیصدی تھے، اور ۱۸۸۸ء میں ۷۹ ہو گئے،

ہم اس موقع پر ایک اجمالی نقشہ دیتے ہیں جو ۱۸۸۸ء کی رپورٹ سے مرتب کیا گیا ہے، اور جس سے تمام اسکولوں اور کالجوں کی تفصیل، ان کے سالانہ مصارف، طالب علموں کی تعداد اور دیگر حالات معلوم ہوں گے،

نام مدرسہ	مصارف سالانہ جو ان ۱۸۸۱ء میں	تعداد طلبہ موجودہ جو ان ۱۸۸۱ء میں	تعداد طلبہ جو فیس دیتے ہیں	تعداد فیس	بلا فیس	جن کو وظیفہ ملتا ہے	کیفیت
مدرستہ الطب	۱۲۴۹۸ پونڈ	۱۸۲	۷۹	سالانہ ۶ پونڈ	۷۴	۲۲	پونڈ کم از کم ۱۵،
مدرستہ الولادت	۸۱۶	۱۱	۰	۰	۱۱	۰	روپیہ کا ہوتا ہے،
مہندس خانہ	۴۱۴۰	۳۳	۷	۱۵ پونڈ	۱۲	۱۸	
مدرستہ الحقوق یعنی قانون کا مدرسہ	۴۱۴۲	۶۲	۲۷	۱۵	۱۵	۱۱	
دار العلوم	۱۵۲۶	۳۱	۰	۰	۰	۳۷	میں نے جب اس کالج کو دیکھا
مدرستہ الترجمہ	۱۴۳۵	۳۰	۳	۶	۲۳	۲	تو ۴۵ طالب العلم تھے،
مدرستہ الصنائع	۷۸۱۹	۲۷۰	۱۲	۶	۲۶۰	۰	
التوفیقیہ	۶۴۱۸	۲۸۸	داخلیہ ۲۵ خارجیہ ۲۲۱	۲۰ ۱۲	۳	۱۵	داخلیہ سے بورڈر،
التجہیزیہ	۷۷۵۴	۳۳۰	داخلیہ ۵۲ خارجیہ ۹۰	۱۶	۱۸۵	۰	خارجیہ سے غیر بورڈر
مبتدیان	۴۲۸۳	۲۵۸	داخلیہ ۶۹ خارجیہ ۸۱	۱۴	۱۱۸	۰	مراد ہیں،
اسکندریہ	۱۳۶۸	۲۱۴	۱۰۹	۱	۷۹	۰	
المنصورۃ	۱۲۹۴	۱۴۳	۸۰	۱	۷۱	۰	

ان سرکاری مدرسوں کے سوا ۲۰ پرائیویٹ اسکول ہیں، جن کا طریقۂ تعلیم اور کورس
بالکل سرکاری مدرسوں کے مطابق ہے اور امتحانات وغیرہ بھی سررشتۂ تعلیم کی نگرانی

ہیں ہوتے ہیں، ۱۸۸۹ء میں ان اسکولوں کا خرچ سالانہ ۸۲۳۳ پونڈ تھا جو کم و بیش ایک لاکھ

پچیس ہزار روپیہ کے برابر ہے، طالب علموں کی تعداد ۱۸۸۸ء میں ۲۳۶۳ تھی،

مدارس اور طالب علموں کی تعداد ہر سال ترقی کرتی جاتی ہے، چنانچہ ۱۸۹۱ء میں

پرائیویٹ اسکولوں کی تعداد ۲۰۰ سے ۱۲۰ ہو گئی جس میں دس ہزار تیرہ سو ۱۰۳۰۰

طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، اسی طرح اس سنہ میں سرکاری مدارس کے طالب العلموں

کی تعداد ۷۳۰۰ اور فیس کی آمدنی ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہو گئی، [1]

مصر کی اصطلاح میں تعلیم کے تین درجے قرار دیئے گئے ہیں،

ابتدائی جس میں چار صفیں ہیں، اور اُس کی کل خواندگی ہمارے یہاں کے مڈل

کلاس کے برابر ہے،

تجہیزی ابتدائی کے بعد شروع ہوتی ہے، اس میں پانچ کلاسیں ہیں، اور

---

[1] خدیو حال کو تعلیم کی ترقی کا نہایت خیال ہے، چنانچہ سنہ حال یعنی ۱۸۹۴ء کے اس اجلاس میں جسمیں سلطنت کا بجٹ پیش ہوا تھا، خدیو موصوف نے خاص تعلیمات کے صیغہ کے متعلق جو گفتگو کی اس کے بعض فقرے یہ تھے، "سررشتہ تعلیم کی وسعت اور ترقی کی نہایت ضرورت ہے، چنانچہ میں نے اس سال رقم سابق پر بارہ ہزار پونڈ (قریبًا دو لاکھ روپیے) کا اضافہ منظور کیا، تعلیم کی طرف لوگوں کا میلان روز بروز بڑھتا جاتا ہے، اس سال بہ نسبت اور سالوں کے پندرہ سو لڑکے کالجوں اور اسکولوں میں زیادہ داخل ہوئے، علی پاشا کی وہ یادداشت جس میں انھوں نے پانسو ابتدائی مکتبوں کا دیہات و قصبات میں کھولا جانا تجویز کیا تھا میں نے اسکی طرف توجہ مائل کی ہے اور میں اس تجویز کو بالکل پورا کرنا چاہتا ہوں"

"بہرحال آپ لوگ تعلیم کی طرف سے مطمئن رہیے، میں اس صیغہ کو بہت قوت دونگا"

اس کی خواندگی ہمارے یہاں کے انٹرنس کے برابر ہے،

خصوصی، یعنی لاکلاس اور دارالعلوم وغیرہ،

مدارسِ تجہیزیہ میں فرنچ یا انگریزی کی بھی تعلیم ہوتی ہے، اور ۱۸۸۸ء سے یہ قاعدہ قرار دیا گیا ہے، کہ ان مدرسوں میں تاریخ، جغرافیہ، علوم طبیعة لازمی طور پر فرنچ یا انگریزی زبان میں پڑھائی جائیں، ان زبانوں کی ترقی کے لئے سررشتہ تعلیم نے یہ حکم جاری کیا کہ ان کی تعلیم صرف یوروپین پروفیسروں کے ذریعہ سے دلائی جائے، اس سے پہلے چونکہ فرنچ کا اثر زیادہ تھا، اس لئے فرنچ پڑھنے والے طلبہ کی تعداد زیادہ تھی، چنانچہ ۱۸۸۹ء میں انکی تعداد ۲۵۰۰ تھی، اور انگریزی خواں صرف ۸۰۰ تھے، لیکن اب انگریزی خوانوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے، اور فرنچ پڑھنے والوں کی تعداد قریبًا وہی ہے، جو ۱۸۸۹ء میں تھی،

اب ہم بڑے بڑے کالجوں اور بعض اسکولوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں،

دارالعلوم

مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالکِ اسلامیہ میں جو کالج مجھکو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لئے کافی سمجھا وہ یہی کالج ہے، میرا ہمیشہ سے یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں، لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو انکی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی، بے شبہہ مشرقی تعلیم کی جو موجودہ اسکیم ہے،

وہ نہایت ابتر اور غیر ضروری ہے، لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں، اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو، وہ مسلمانوں کے مذہب قومیت، تاریخ، کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی،

جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے، وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے، یعنی نئی تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہے اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے، صرف یہ دارالعلوم ہے، جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ ابھی پورا کامیاب نہیں ہوا، اس کالج کا اوّل جس کو خیال آیا وہ **علی پاشا مبارک** مصر کا ایک مشہور روشن ضمیر ہے، اس نے خود مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں حاصل کی ہیں اور یورپ کی متعدد زبانیں جانتا ہے، وہ کئی دفعہ مصر کے سررشتۂ تعلیم کا افسر رہ چکا ہے، اسکی تاریخی تصنیفات تمام ممالکِ اسلامیہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اور درحقیقت نہایت مفید ہیں، اس نے جامع ازہر کی طرزِ تعلیم کی بھی اصلاح کرنی چاہی تھی، لیکن ازہر کے شیوخ راضی نہ ہوئے غالباً اس کے بعد اس نے اس کالج کی بنیاد ڈالی،

اوّل اوّل اس کالج کا ظاہری مقصد یہ قرار دیا گیا کہ اس کے تعلیم یافتہ، مدارس سرکاری کی مدرسی کے لئے انتخاب کئے جائیں، لیکن ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ کی اجازت کے مطابق سررشتۂ تعلیم نے یہ قاعدہ منظور کیا کہ اس کے سند یافتہ جج اور قاضی و مفتی مقرر ہو سکیں، اس کے ساتھ کورس میں اور متعدد علوم اضافہ کئے گئے اور ایک کمیٹی نے جس کا پریسیڈنٹ **جامع ازہر** کا شیخ الشیوخ تھا، اس کے کورس کے لئے کتابیں منتخب کیں،

اس کالج میں داخل ہونے کی ضروری شرط یہ ہے کہ طالب علم مشرقی علوم میں سے نحو، صرف، فقہ، اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث میں مناسب استعداد رکھتا ہو،

تعلیم کی کل مدت چار برس ہے اور جو علوم پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ہر ہفتہ میں ان کے درس مقرر کیے گئے ہیں ان کی تفصیل نقشۂ ذیل سے معلوم ہوگی،

علوم جو پڑھائے جاتے ہیں	پہلا سال	دوسرا سال	تیسرا سال	چوتھا سال
فقہ	ہفتہ میں ۵ سبق	ہفتہ میں ۵ سبق	ہفتہ میں ۵ سبق	ہفتہ میں ۵ سبق
تفسیر	۰	۰	۲	۲
تاریخ طبیعی	۲	۲	۰	۰
علومِ بلاغت	۲	۲	۰	۰
اُصولِ فقہ	۰	۰	۲	۲
حکمۃ عملیہ	۱	۰	۰	۰
جبر و مقابلہ و حساب	۴	۴	۴	۴
جغرافیہ	۲	۲	۲	۲
تاریخ عمومی	۱	۱	۱	۱
فن انشاے عربی	۳	۳	۴	۴
مختلف خطوط	۴	۴	۴	۴
تصویر کشی	۱	۱	۰	۰
ادبیات لغت عربیہ	۰	۰	۳	۳
قسموغرافی،	۰	۰	۱	۱

طبیعات	۰	۰	۲	۲
حدیث، کلام، منطق	۰	۲	۱	۰
نحو صرف، رسم خط، عروض، قوافی	۳	۲	۰	۰

چونکہ اس کالج میں وہی طلبہ داخل ہو سکتے ہیں جو علوم عربیہ اور فقہ و حدیث سے واقف ہوں اور اس قسم کے طلبہ وہی ہو سکتے ہیں جنھوں نے قدیم طریقہ پر تعلیم پائی ہے، اسلئے کالج میں طالب علموں کی تعداد بہت کم ہے، اگرچہ سررشتۂ تعلیم نے اسی لحاظ سے اس کالج میں کچھ فیس نہیں مقرر کی بلکہ بجائے اسکے ہر طالب علم کو ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے، ایک وقت کا کھانا بھی کالج ہی سے ملتا ہے، طالب علموں کے لئے جو لباس مقرر کیا گیا ہے وہ بھی وہی قدیم مولویانہ لباس ہے، جو لوگ یہاں سے تعلیم پاکر نکلتے ہیں اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز بھی ہوتے ہیں، یہ سب کچھ ہے لیکن جن لوگوں کو پرانی تعلیم نے ایک دفعہ بھی چھو لیا تمام عمر کے لئے انکو علوم جدیدہ سے وحشت ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ علوم عربی ہی زبان میں تعلیم دیئے جاتے ہیں، میں نے جب اس کالج کو دیکھا تو اس میں ۴۵ طالبعلم تھے، جنمیں سے اکثر جامع ازہر کے تعلیم یافتہ تھے، درس کا طریقہ بھی یہاں خاص ہے، استاد یا شاگرد کسی کے ہاتھ میں کتاب نہیں ہوتی، استاد زبانی لکچر دیتا ہے، اور اس وقعت اور فصاحت سے تقریر کرتا ہے کہ خود دل پر نقش ہو جاتی ہے، اسی لحاظ سے مصر کے نہایت نامور علما اس کی پروفیسری کے لئے انتخاب کئے گئے ہیں، مثلاً شیخ حمزہ فتح اللہ پروفیسر ادب، شیخ حسن الطویل معلم الحدیث، ڈاکٹر عثمان بک پروفیسر تاریخ طبعی، یہ سب مصر کے مشہور علما ہیں، اور ان کی تصنیفیں نہایت قدر کے قابل خیال کیجاتی ہیں، مصر میں

آج جو لوگ عربی کے نامور انشا پرداز ہیں، اگر اسی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں، ادب کا جو کورس مقرر کیا گیا ہے، وہ کوئی خاص کتاب یا چند کتابوں کا انتخاب نہیں ہے بلکہ عربی لٹریچر کے وہ تمام نادر حصے جن کو فن ادب کی جان کہنا چاہیئے، اسی طرح تفسیر میں صرف ان آیتوں کا درس ہوتا ہے، جو بلحاظ بلاغت یا اخلاق یا مسائلِ کلام زیادہ مہتم بالشان ہیں، چنانچہ ۱۸۹۰ء میں جو نصابِ تعلیم مقرر کیا گیا اس میں ان تمام مقامات کی تفصیل کر دی گئی ہے اور وہ سرکاری مطبع میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے،

ادب اور فقہ کے درس میں میں خود بھی شریک ہوا تھا، دونوں پروفیسروں نے جس فصاحت اور خوبی سے تقریر کی اب تک میرے دل میں نقش ہے کاش ہمارے یہاں کے علماء بھی اس طریقہ کی تقلید کرتے، طالب علموں کی استعداد کا حال اس سے ظاہر ہوگا کہ جس وقت ہم کالج کی سیر کر رہے تھے، احمد بک نظیم نے جو کالج کے سکریٹری ہیں، ایک طالب علم کو جس کا نام احمد قوصی تھا بلایا اور اس سے کہا کہ قلم دوات لیکر بیٹھ جاؤ اور اسی وقت ان کی شان میں (میری طرف اشارہ کر کے) کچھ اشعار لکھو، وہ سامنے ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ اشعار لکھ کر سنائے،

محمد انت شبلی المعالی	لقد فقت الوری وعلوت قدرا
وقد الیتنا شرفا وفضلا	بتشریف زیارۃ ارض مصرا
فلاذ لنا نزالک بکل انس	تزید تفضلا ونزید شکرا

اگرچہ شبلی المعالی کی ترکیب بے جوڑ ہے اور دوسرے شعر میں اقوار ہے تاہم خوبی زبان و برجستگیِ ادا کے لحاظ سے میں نے بہت داد دی،

مدرستہ الحقوق

اس کالج میں قانون کی تعلیم ہوتی ہی، اور یہاں کے سند یافتہ سول عہدوں پر مامور ہوتے ہیں، اس کالج میں داخل ہونے کی ضروری شرطیں یہ ہیں کہ طالب علم کی عمر ۱۶ برس سے زیادہ ہو، تجہیزی تعلیم (انٹرنس کلاس) کی سند رکھتا ہو، چال چلن اچھا ہو، بچپن میں چیچک کا ٹیکا لگوا چکا ہو، تندرستی اچھی ہو، داخلہ کے وقت ایک خاص امتحان تحریری و تقریری لیا جاتا ہے، تحریری میں فرنچ اور عربی کی زباندانی کے متعلق سوالات ہوتے ہیں، اور تقریری میں ان کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ بھی داخل ہے، اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اس کو اپنے باپ یا کسی مربی کا ایک خط پیش کرنا ہوتا ہے، جس کے یہ الفاظ ہوتے ہیں کہ" کالج کے خارج اوقات میں میں ایس لڑکے کے چال وچلن کا ذمہ دار ہوں" ان تمام باتوں کے بعد ۱۵ پونڈ یعنی کم وبیش دو سو روپیے بطور فیس کے داخل کرنے ہوتے ہیں، اور اس وقت طالب علم کالج میں داخل کر لیا جاتا ہے، تعلیم کی مدت چار برس ہی اور مضامین جو تعلیم میں داخل ہیں، حسب ذیل ہیں،

سال اول، عربی، فرنچ، ترجمہ، مسک دفاتر (یعنی املا و تحریر) شریعت اسلامیہ قانون قضا و عدالت، عام قانون اور پالٹیکس کے اصول عام،

سال دوم، علاوہ مضامین بالا کے رومن لا قانون فوجداری،

سال سوم، علاوہ مضامین بالا کے پولیٹکل اکونمی، تعزیرات، مرافعات،

مدینہ، و تجاریہ،

سال چہارم، شریعت اسلامیہ، پولیٹکل اکونمی، مرافعات، قانون تجارت، قانون عدالت، خاص سلطنت کا قانون،

ہرسال مختلف مضامین میں امتحان لئے جاتے ہیں، اور یہ تمام امتحانات اور اخیر امتحان فرنچ زبان میں ہوتا ہی، صرف شریعت اسلامی کا امتحان عربی زبان میں ہوتا ہی، طالبعلموں کو جب کسی قدر قانونی استعداد حاصل ہو جاتی ہی تو ہائیکورٹ اور دوسری عدالتوں میں کارروائی سے واقف ہونے کے لئے بھیجے جاتے ہیں اور حکم ہوتا ہی کہ مقدمات کا خلاصہ لکھیں، خود کالج میں بھی عدالت کی مسلیں منگائی جاتی ہیں اور طالب علموں سے انکے متعلق تحریری دعویٰ، بیانات تحریری، ادائے شہادت، سوالاتِ جرح اور فیصلہ مقدمہ کی مشق کرائی جاتی ہے، میں نے اس کالج کی اچھی طرح سیر کی، کالج کا سکریٹری ایک فرنچ ہی، وہ تو عربی سے بالکل ناواقف ہی، لیکن اس کا نائب ایک نوجوان مسلمان ہے جو نہایت لائق شخص ہے، اور متعدد زبانیں جانتا ہی، وہ کالج کا پروفیسر بھی ہی اور فرنچ زبان میں نہایت برجستگی سے لکچر دے سکتا ہی، مجھ کو اپنے کلاس میں لے گیا، اور کہا آج فرنچ میں لکچر دینے کا دن تھا، لیکن میں تمھاری خاطر سے عربی میں لکچر دونگا، چنانچہ تعزیرات کے اصول پر کھڑے ہوکر لکچر دیا، اور نہایت فصاحت اور وسعت سے تقریر کی، تمام کلاسوں میں جس قدر لڑکے تھے پاکیزہ صورت اور پاکیزہ لباس تھے، اور ان کے چہروں سے متانت اور وقار ٹپکتا تھا،

مدرستہ الترجمہ

مصر میں چونکہ فرنچ اور انگریزی کا بہت اثر ہے اور تمام بڑے بڑے ملکی عہدے انہی دونوں قوموں کے ہاتھ میں ہیں، مصریوں کو ان کے ساتھ تعلق رکھنے اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے کے لئے فرنچ اور انگریزی زبان سیکھنی پڑتی ہے، اس کالج کے قائم کرنے کی اصلی غرض اسی قدر تھی اور اسی وجہ سے ابتدا میں وہ زباندانی کی تعلیم پر محدود تھا اور ایک معمولی اسکول کہا جا سکتا تھا، لیکن ۱۸۸۹ء میں اسکی اسکیم بہت وسیع کر دی گئی، اور چار پروفیسر اور بڑھائے گئے، جن میں ایک فرنچ ہے، عربی، ترکی، فرنچ، انگریزی زبانوں کے علاوہ مضامین ذیل کی تعلیم بھی ضروری قرار دی گئی، جغرافیہ، تاریخ، حساب، ہندسہ، جبر، علوم طبعیہ، کیمیا، فقہ، توحید، یہ تمام مضامین بجز فقہ و توحید کے فرنچ میں پڑھائے جاتے ہیں، اور بعض مضامین انگریزی زبان میں بھی، اس کالج نے جس طرح مصر کو ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے فائدہ پہنچایا ہے، علمی ترقی کیلئے بھی وہ نہایت مفید ثابت ہوا ہی، مصر کی علمی زبان ابتک عربی ہے، اور غالباً ہمیشہ رہے گی، کالجوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، عموماً فرنچ زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں، ایک خاص محکمہ اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ فرانس میں ڈاکٹری وغیرہ کی جو نئی عمدہ تصنیف شائع ہو فوراً ترجمہ کر لیجائے، اور کالجوں کے کورس میں داخل کیجائے، چنانچہ اس وقت تک سیکڑوں کتابیں ترجمہ ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں، ان تمام ضرورتوں کو اسی کالج نے پورا کیا ہی،

مدرسۃ الطب

یہ بہت بڑا کالج ہے اور اس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ سے زیادہ ہی، کالج کی عمارت نہایت وسیع ہے، اور مختلف مضامین کی تعلیم کے لئے کثرت سے جداگانہ بڑے بڑے کمرے مخصوص ہیں تشریح کیلئے جو کمرہ ہی وہ نہایت وسیع ہی اور اسمیں ہر وقت بہت سی لاشیں موجود رہتی ہیں جن پر تشریح کے تجربے عمل میں آتے ہیں، ۱۸۸۵ء میں میگر د جبرانی کی تعلیم کے لئے انکے متعلق جداگانہ کارخانہ کھولا گیا، علم الحیوانات کی تعلیم ایک وسیع مکان میں ہوتی ہے، جسمیں مختلف قسم کے جانور نہایت کثرت سے موجود ہیں، کالج کے احاطہ میں ایک باغ ہی جو علم نباتات کی غرض سے تیار کیا گیا ہی اور اس میں سینکڑوں مختلف اقسام کے نباتات ہیں، جنکی پرداخت میں نہایت اہتمام و نگرانی کی جاتی ہے، علم الکیمیا بھی اس کی تعلیم کا ضروری جز ہی، ۱۸۸۸ء تک اسکی تعلیم صرف نظری طریقہ پر ہوتی تھی، ۱۸۸۶ء میں عملی تجربوں کے لئے کالج کی عمارت میں متعدد بڑے بڑے کمرے اضافہ کئے گئے اور ۱۸۸۸ء میں گیس وغیرہ اور جو چیزیں عملی تجربہ کے لئے ضروری ہیں، اسمیں مہیا کی گئیں، ہر سال اس کالج سے ایک گروہ کثیر تعلیم پاکر نکلتا ہے، جن میں سے بعض تکمیل تعلیم کے لئے یورپ بھیجے جاتے ہیں،

تمام کتابیں جو اس کالج کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں، عربی زبان میں ہیں، اور فرنچ وغیرہ سے ترجمہ کی گئی ہیں، چونکہ یورپ میں ہمیشہ اور علوم و فنون کی طرح علم طب بھی روز افزوں ترقی کرتا جاتا ہے، اور ہر سال اس کے مسائل میں بہت سی نئی معلومات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے ایک کمیٹی خاص اس غرض سے مقرر ہے کہ اس قسم کی جو کتاب

فرنچ وغیرہ میں شائع ہو اسی وقت عربی زبان میں ترجمہ کرلی جائے اور اس کالج کے کورس میں داخل کی جائے، اس طریقہ سے علم طب کے متعلق ترجمہ شدہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تیار ہوگیا ہے، جس کی تعداد کتب خانہ خدیویہ کی فہرست سے معلوم ہو سکتی ہی، مصر کے علماً نے بہت سی کتابیں اس فن میں خود بھی تصنیف کی ہیں، اور یونانی و موجودہ طبابت میں محاکمہ بھی کیا ہی، کاش ہمارے ملک کے اطبا جو انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے یورپ کی تحقیقات سے محروم ہیں، ان جدید تصنیفات کو بہم پہنچاتے اور ان سے مستفید ہوتے لیکن ہماری قوم میں یہ ہمت کہاں! حالانکہ سچ پوچھئے تو کچھ ہمت کی بات بھی نہیں،

اس کالج میں کل ۱۵ پروفیسر ہیں جن میں سے تین یورپین اور باقی مصری ہیں،

بقیہ کالج اور اسکول

ان کالجوں کے سوا اور متعدد کالج انجینیری، صناعی، وغیرہ کے ہیں اور ترقی کی حالت میں ہیں، انجینیرنگ کالج میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے داخلہ امتحان کے متعلق جو قواعد ہیں ایک جداگانہ رسالہ میں چھاپے گئے ہیں، جس کے صفحوں کی تعداد ۱۵ ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی اسکیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے، میں جب اس کالج میں گیا تو پرنسپل نے مجھ سے شکایت کی کہ موجودہ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے اس کالج کو نہایت نقصان پہنچایا ہے، اس کے قبل یہاں کے کورس وہی تھا جو فرانس کے انجینیرنگ کالج کا ہی، اور اسی غرض سے تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے، لیکن حال کے ڈائرکٹر نے حکم دیا ہی کہ تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جائیں اور ہندوستان کے رڑکی کالج کی تقلید کی جائے، پرنسپل صاحب کہتے تھے کہ رڑکی کی

مستعملہ کتابیں یہاں منگوائی گئیں اور میں نے ان کو دیکھا وہ یہاں کے موجودہ کورس سے نہایت کم رُتبہ کی کتابیں ہیں، مگر افسوس ہی کہ ہم کو اسکی تعلیم پر مجبور کیا جاتا ہی"

مدرستہ الصنائع جس میں صنعت اور حرفت کی تعلیم ہوتی ہی اور جس کا سالانہ خرچ ایک لاکھ سے زیادہ ہی، نہایت ترقی کی حالت میں ہی، نجاری، حدادی وغیرہ صنعتیں جو سکھائی جاتی ہیں، علمی طریقہ سے سکھائی جاتی ہیں، اور اس بنا پر کوئی طالب علم جب تک تعلیم ابتدائی (جو مڈل کے برابر ہی) حاصل نہ کر چکا ہو اسمیں داخل نہیں ہو سکتا، عربی و فرنچ و انگریزی زبانوں کے علاوہ، علوم ریاضیہ، مشین، کیمیا، طبیعیات کے ابتدائی حصے بھی پڑھائے جاتے ہیں، ہر روز تین گھنٹے ان نظری علوم کی تعلیم ہوتی ہی، اور سات گھنٹے مختلف صنعتوں کی علمی مشق کرائی جاتی ہے، سر رشتۂ تعلیم نے رپورٹ کی ہی کہ اس مدرسہ کو نہایت ترقی ہے، اور جو چیزیں وہاں تیار کیجاتی ہیں، تعجب انگیز ہیں،

عام اسکول بھی کثرت سے ہیں، مدارسِ تجہیزیہ دو ہیں، توفیقیہ، تجہیزیۂ توفیقیہ کا سالانہ خرچ ایک لاکھ سے زائد ہے، اور قریبًا چار سو طلبہ اس میں تعلیم پاتے ہیں، اس میں ابتدائی صفیں بھی شامل ہیں، اس مدرسہ کا مکان نہایت خوبصورت اور خوش فضا ہی، خدیو مصر نے شاہی عمارتوں میں سے ایک وسیع مکان جس کا نام قصر النزہتہ ہی مدرسہ کو عنایت کیا اور چونکہ اسکی وضع تعلیمی اغراض کے مناسب نہ تھی پچاس ہزار روپیہ اس غرض کے لئے اور عنایت کئے کہ حسب ضرورت اس میں ترمیم و اصلاح کیجائے، چنانچہ سکریٹری مدرسہ کی ہدایت کے مطابق اسکی عمارت میں ترمیم اور اضافہ کیا گیا، چونکہ مدرسہ میں تعلیم کے تین درجے تھے، قسم خاص، ابتدائی، تجہیزی، ان تینوں کے لئے جداگانہ عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ۳۵۰ طالب علموں کیلیے نئے بورڈنگ کے کمرے بنائے گئے، مدرسہ کے متعلق

دو بڑے بڑے کمرے تصویر کشی اور کیمسٹری کی مشق کے لئے ہیں، اور نہایت خوش نما ہیں،

تجہیزیہ اس کا سالانہ خرچ کم و بیش دو لاکھ ہے، اور چار سو لڑکے اس میں تعلیم پاتے ہیں، بورڈروں سے ۲۵ پونڈ یعنی ساڑھے چار سو روپئے سالانہ فیس لیجاتی ہے، بورڈنگ اگرچہ وسیع نہیں اور نہ طالب علم کے لئے الگ الگ کمرے ہیں، لیکن تمام لڑکے نہایت سلیقہ اور صفائی کے ساتھ رہتے ہیں، میں جس وقت اس مدرسہ میں گیا کھانے کا وقت تھا، سکریٹری مدرسہ نے جس کا نام احمد بک نظیم ہے، مجھ سے کہا کہ پہلے کھانے کے کمرہ کی سیر کیجئے، کمرہ نہایت وسیع اور خوش نما تھا، اور دو تین میزیں اور کثرت سے کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، کھانے کا طریقہ اگرچہ قسطنطنیہ اور شام کے موافق تھا، یعنی چار شخصوں کے آگے ایک ایک پلیٹ تھی، چھری کانٹے بالکل نہ تھے، تاہم مجھ کو تعجب بلکہ حیرت ہوئی کہ لڑکے اس خوبی اور صفائی سے کھاتے تھے کہ ان کے ہاتھ مطلق نہیں بھرتے تھے، نہ میز کی چادر پر کہیں دھبہ تھا، آپس میں بات چیت کرتے تھے، لیکن شور وغل کا کیا ذکر ہے، گونج تک نہ تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ مدرسہ کے افسروں میں سے دو ایک ہمیشہ طالب علموں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، اور ہر ہفتہ میں کھانا کھانے کی تہذیب و شائستگی پر لکچر دیا جاتا ہی،

یورپ میں تعلیم پانے والے

مصر میں مدت سے یہ طریقہ جاری ہے کہ ہر سال سلطنت کی طرف سے چند طالب علم تکمیلِ تعلیم کے لئے یورپ بھیجے جاتے ہیں، یہ تعداد اس مناسبت سے

ہوتی تھی کہ ہمیشہ تیس طالب علم یورپ میں موجود رہتے ہیں سفر اور وہاں کے قیام کا تمام صرف گورنمنٹ مصر کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اگرچہ گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے یہ مصارف برداشت کئے، لیکن بدقسمتی سے گورنمنٹ اور ملک کو ایک مدت تک فائدہ نہ پہنچا، جو لوگ تعلیم پاکر آئے ان میں (ہمارے ہندوستان کی طرح) بہت کم ایسے نکلے جو کسی فن میں کامل ہوں، یا ان کی ذات سے ملک کو کسی قسم کا فائدہ پہنچ سکے آخر سررشتہ تعلیم کے افسر نے اس پر توجہ کی، اور غور و تحقیق کے بعد اس نقصان کے اسباب دریافت کئے، جن میں سے ایک بڑا سبب یہ تھا کہ لڑکوں کے انتخاب میں غلطی ہوتی تھی، یورپ کی اکثر بڑی عمر کے لڑکے بھیجے جاتے تھے، اور چونکہ ابتدائی تعلیم و تربیت عمدہ نہیں ہوتی تھی، یورپ کی تعلیم و تربیت کا اثر ان پر بہت کم پڑتا تھا، اس وقت سے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ آیندہ سے جو لڑکے بھیجے جائیں ان کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ ہو، اس میں ایک یہ مشکل تھی کہ مذہب اور عربی زبان کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ اسکے لئے یہ قاعدہ قرار دیا گیا کہ چند علما طالب علموں کے ساتھ جائیں جو عربی زبان اور مذہب کی تعلیم دیتے رہیں، یہ طریقہ نہایت مفید ثابت ہوا اور چونکہ ملک نے ان طالب علموں کی عمدہ مثالیں دیکھیں لوگ اپنی اولاد کو اپنے صرف سے بھیجنے لگے، یہاں تک کہ ۱۸۸۸ء میں جس قدر لڑکے یورپ میں تعلیم پاتے تھے ان میں ۲۵ گورنمنٹ کی طرف سے اور ۵۲ خود اپنے صرف سے تعلیم پاتے تھے ۱۸۸۸ء میں جس قدر طالب علم موجود تھے اور جن علوم میں انکی تعلیم ہوتی تھی، اُن کی تفصیل یہ ہے،

حکومت کے صرف سے	اپنے خاص صرف سے	جن صیغوں میں تعلیم پاتے تھے،
۵	۱۷	بیرسٹری

ڈاکٹری	۱۲	۴
امور مالیہ	۰	۱
معلمی یا پروفیسری	۰	۳
زراعت	۲	۰
بیرسٹری کے لئے تیاری	۰	۱
ٹکنیکل کالج کے لئے تیاری	۱	۰

ان میں سے ۱۳ طالب العلم نے جو سلطنت کی طرف سے وظیفہ پاتے تھے نہایت اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کیں، ایک ان میں رشدی طبوزادہ تھا، جس کو بیرسٹری میں ڈاکٹری کی سند ملی ایک لڑکا جس کا نام اسمٰعیل آفندی تھا، اور فرانس کے کالج میں پروفیسری کی تعلیم پاتا تھا، طبیعیات کے امتحان میں تمام کالج میں اس کا دسواں نمبر رہا، حالانکہ کل امیدوار جو امتحان میں شریک تھے ۱۵۳ تھے، اور سب فرانس کے رہنے والے تھے، ایک اور لڑکا جس کا نام عبداللہ تھا اس نے پولیٹکل اکانمی میں سب سے اوّل درجہ کا انعام حاصل کیا، ان طالب علموں کے سوا چند اور طالب علم انگلستان، اٹلی، جرمنی میں تعلیم پاتے ہیں، ان میں سے بعض کلوں کے بنانے کا کام سکھیتے ہیں، اور ان سب کا صرف گورنمنٹ مصر ادا کرتی ہے،

یورپ میں تعلیم پانے کے متعلق ۱۸۸۸ء کی رپورٹ میں ڈائرکٹر تعلیم نے ایک نہایت مفید اور مدلل تقریر لکھی ہے، اس میں اہل ملک سے خطاب کیا ہے کہ اگر وہ لوگ چند خاص باتوں کا لحاظ نہ رکھیں گے تو یورپ کی تعلیم سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، جیسا کہ مدت دراز کے تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے، وہ لکھتا ہے کہ یا تو نہایت

کم عمر کے ہوں تو ضرور ہے کہ یورپ جانے سے پہلے ایف اے کی سند حاصل کر چکے ہوں،
ہمارے ہندوستان میں بھی یہ عام شکایت ہے کہ یورپ کی تعلیم میں جو مصارفِ کثیر برداشت
کئے جاتے ہیں، ان کا کافی صلہ نہیں ملتا، یہ شکایت بالکل سچ ہے، اور غالباً اس کی وہی وجہ ہے
جو مصر کے ڈائرکٹر تعلیم نے بیان کی،

قدیم تعلیم
و
جامع ازہر

یہاں کی قدیم تعلیم، دوسرے لفظوں میں جامع ازہر کی تعلیم ہے، اس لئے قدیم
تعلیم کی کیفیت بیان کرنے کے لئے جامع ازہر کے حالات بیان کرنے کافی ہیں، یہ
وہی جامع ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کل دنیا میں اس سے قدیم کوئی یونیورسٹی
نہیں ہے، یہ ایک جامع مسجد ہے اور قاہرہ میں سب سے پہلی مسجد جو تعمیر ہوئی وہ یہی
ہے، فاطمئین مصر میں سے خلیفہ المعز لدین اللہ کے ایک غلام نے جو سسلی کا رہنے والا
تھا، اور اپنی قابلیتِ خداداد سے دولتِ فاطمیہ کا دست و بازو بن گیا تھا، ۳۵۹ھ میں
اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور ۳۶۱ھ میں انجام کو پہنچی، ۳۷۸ھ میں خلیفہ عزیز باللہ نے مسجد
سے متصل طالب علموں کے لئے کچھ مکانات بنوائے، اور ۳۵ طالب علموں کے لئے
وظیفہ مقرر کیا، حاکم بامر اللہ نے ۴۰۰ھ میں مسجد کی عمارت میں تجدید کی، اور اس کے
مصارف کے لئے ۱۶۷ دینار منافع سالانہ کی جائداد وقف کی، ۶۶۱ھ میں امیر طواشی
نے یتیموں کے لئے ایک خاص مکتب قائم کیا، اور اس کے ساتھ عام طلبۂ مسجد کیلئے

بہت سی جائدادیں وقف کیں، رفتہ رفتہ بہت بڑا دارالعلوم بن گیا، یہانتک کہ ۱۸۹۰ء
میں اس کے طالب علموں کی تعداد ۰۰، سے متجاوز تھی، جسمیں ہر ملک اور ہر قوم کے اشخاص
تھے، اور آج تو یہ حالت ہے کہ کثرتِ طلبہ کے لحاظ سے تمام دنیا کی کوئی یونیورسٹی اسکی
ہمسری نہیں کرسکتی، کم وبیش چار ہزار طالب علم خود مسجد میں سکونت رکھتے ہیں، بہت سے
پاس پاس کی مسجدوں میں رہتے ہیں، لیکن کھانا یہیں سے ملتا ہی، غرض ہر قسم کے طلبہ
کی تعداد جن کو جامع ازہر سے تعلق ہے، بارہ ہزار سے متجاوز ہے، ہر ملک کے طالبعلمون
کے لئے الگ الگ بالاخانے ہیں، جن کو یہاں رواق کہتے ہیں، بہت سے طالب علم
بلکہ کثرت سے ایسے ہیں، جن کے لئے مکان یا حجرہ کچھ بھی نہیں، مسجد کے صحن میں سیکڑوں
بلکہ ہزاروں چھوٹی چھوٹی الماریاں اور برتلے چنی ہیں، یہی ان کے توشہ خانے ہیں جنمیں
وہ اپنے کپڑے اور ضروری اسباب رکھتے ہیں، سونے بیٹھنے کے لئے مسجد کا تمام
صحن پڑا ہوا ہے، اوّل اوّل جب میں اس مسجد کی زیارت کے لئے گیا تو دور سے
گونج کی آواز آئی، اندر داخل ہوا تو ہر طرف طالب علم ہی طالبعلم نظر آتے تھے، جا
بجا مدرسین درس دے رہے تھے اور ایک ایک کے گرد تیس تیس چالیس چالیس
کا مجمع تھا، یہ حلقے تیس چالیس سے کم نہ تھے، اور چونکہ پاس پاس تھے، اسلئے اسقدر
شور وغل تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، مجھ کو خیال ہوا کہ آج کوئی خاص
دن ہی اور اس وجہ سے کثرت سے طلبہ جمع ہو گئے ہیں، لیکن دو چار روز رہکر یہ معلوم
ہوا کہ یہ معمولی حالت ہی، مجھ کو خیال ہوا کہ اس ہنگامہ میں جمعیتِ خاطر ایک طرف مدرسین
کی آواز بھی طالب العلم کے کان تک پہنچتی ہے یا نہیں،

جن جن ملکوں مثلاً شام، مغرب، جزیرہ، عراق، بخارا، خراسان، افغانستان،

ہندوستان وغیرہ کے طالب العلموں کے لئے رواق بنے ہیں، وہاں کے لوگ ہمیشہ سوداگروں کے ذریعہ سے سالانہ رقم بھیجتے ہیں، جو ان طلبہ کو جیب خرچ کے طور پر دیجاتی ہے، معمولی کھانا خود ازہر سے ملتا ہے، لیکن چونکہ صرف روٹیاں ملتی ہیں، اسلئے سالن کا اہتمام ان کو خود کرنا پڑتا ہے، بہت سے طلبہ جن کو چارچار پانچ پانچ روٹیاں ملتی ہیں نان بائی کو دو تین روٹیاں دیکر اس کے بدلہ سالن لے لیتے ہیں، اور اس طرح انکے جیب خرچ پر چنداں بار نہیں پڑتا، روٹیوں کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ وقت معین پر طلبہ کا ایک گروہ بازار میں (جو مسجد کے سامنے ہے) دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، اور روٹیاں تقسیم ہونی شروع ہوتی ہیں، ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ آتا ہے، اور یہ سلسلہ کئی گھنٹہ تک قائم رہتا ہے، طالب علموں کے ہاتھ میں کوئی تولیہ یا رومال نہیں ہوتا، جس طرح بھیک منگے جو کچھ ملتا ہے ہاتھ پھیلا کر لے لیتے ہیں، ان طالب علموں کا بھی یہی حال ہے،

مدرسین کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے، مدرس اوّل جو شیخ ازہر کہلاتا ہے اور جس کی تنخواہ چھ سات سو ماہوار سے کم نہیں ہوتی نہایت معزز سمجھا جاتا ہے، یہانتک کہ خود حکومت اس کا پاس کرتی ہے، اس مدرسہ کا مجموعی خرچ دو تین لاکھ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے ۱۸۹۴ء میں علاوہ اس رقم کے سر رشتۂ تعلیم سے دو لاکھ سالانہ کی رقم اور منظور ہوئی،

مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دار العلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں، جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طالب علموں کی

تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اسکی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید نہیں ہو سکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے، اور کرتا جاتا ہے، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے، اور جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری، جوش ہمت، غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے، میں نے یہاں ایسے طلبہ دیکھے ہیں، جن کے عزیز اور نہایت قریب عزیز (چچا، ماموں وغیرہ) خود اسی شہر میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں اور ان کی تمام ضروریات کے متکفل بھی ہیں، تاہم چونکہ یہ طلبہ از ہر میں رہتے ہیں، اسلئے ان کو عام بازار میں ہاتھ پھیلا کر روٹیاں لینے میں ذرا شرم نہیں آتی طالبعلموں کی دنائت اور پست حوصلگی کا یہ حال ہے کہ بازار میں پیسہ کی ترکاری خریدتے ہیں تو کنجڑے کو قسم دلاتے جاتے ہیں کہ بِرَاس سیدنا الحسین یعنی تجھکو امام حسینؑ کے سر کی قسم واجبی قیمت بتانا، کیا اس قسم کے تربیت یافتہ لوگوں سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کی عظمت و شان بڑھائیں گے؟ ہمارے ملک میں اس قسم کے جو مدرسے ہیں، ازہر اُن سے بھی گیا گذرا ہے،

اس سے زیادہ تر افسوس تعلیم کی ابتری کا ہے، یہاں مستقل اور اصلی طور پر صرف فقہ و نحو کی تعلیم ہوتی ہے اور دونوں کے لئے آٹھ آٹھ برس مقرر ہیں، منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ تو گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، معانی، بیان کی تعلیم ہے، لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دار العلم کے کسی طرح شایانِ شان نہیں، نحو اور فقہ جس پر ایک عمر صرف کی جاتی ہے، ان کی تعلیم بھی محققانہ اور مجتہدانہ نہیں ہوتی، کافیہ وغیرہ کی شرحیں، شرحوں کے حواشی اور حواشی کے حواشی پڑھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں، شیخ طبان حال میں ایک بزرگ گذرے ہیں،

ان کی ایک شرح ہے، اس شرح کو اس قدر مہتم بالشان سمجھا گیا ہی کہ اس کی شرحیں اور شرحوں کے حاشیے درس میں داخل ہیں، اور اس تمام سلسلہ کا ضبط و حفظ کرنا بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے، چونکہ میں نے خود ازہر میں قیام کیا تھا، اکثر طلبہ سے صحبت رہتی تھی، میں ان کو نہایت معمولی ناقابلِ التفات جزئی بحثوں میں مصروف دیکھتا تھا، اور افسوس کرتا تھا، اسی لغو طریقۂ تعلیم کا اثر ہے کہ ایک مدت سے ازہر نے کوئی قابلِ قدر عالم اور مصنف نہیں پیدا کیا، میں نے طلبہ سے دریافت کیا کہ شیخ ازہر جو استاد الکل خیال کئے جاتے ہیں، ان کی کوئی تصنیف بھی ہے، انھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہاں صبان پر بڑے معرکہ کے حاشیہ لکھے ہیں،

زیادہ افسوس یہ ہے کہ تعلیم کسی اصول پر نہیں ہے، نہ صف بندی ہے، نہ کوئی خاص نصاب ہے، نہ امتحان ہوتا ہی، نہ ترقی پانے کے لئے کوئی قاعدہ مقرر ہے، افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان ابتریوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں، علی پاشا مبارک نے جو ایک زمانہ میں سر رشتہ تعلیم کا افسر تھا کچھ اصلاح کرنی چاہی تھی اس پر ازہر کے تمام علما اس کے دشمن بن گئے، اور چونکہ شیخ ازہر کا اثر طلبہ پر منحصر نہیں بلکہ تمام ملک اس کو مذہبی پیشوا تسلیم کرتا ہے، اس لئے پاشاے موصوف کو اغماض کرنا پڑا، ازہر حقیقت میں ایک ملکی طاقت ہے، اور خود سلطنت اسکی مخالفت پر بآسانی جرأت نہیں کر سکتی،

کتب خانہ خدیویہ

یہ نہایت عالیشان کتب خانہ ہے، اور ترتیب و خوش اسلوبی، زیب و زینت، حسن انتظام، خوبی عمارت میں قسطنطنیہ کے تمام کتب خانوں سے بہتر ہے، عمارت نہایت شاندار و وسیع ہے، اور مختلف حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ سیر و مطالعہ کے لئے مخصوص ہے، اس میں تین بڑے بڑے کمرے ہیں، ایک کمرہ میں بہت لمبی میز ہی جس پر رجسٹر اور فہرست کی جلدیں چنی ہیں، ایک کمرہ مطالعہ اور ایک نقل و کتابت کے لئے خاص ہی جو شخص کوئی کتاب لینی چاہے افسر کتبخانہ اسکو ایک چھپا ہوا کارڈ دیتا ہی، کارڈ میں مفصلہ ذیل عنوان ہوتے ہیں، کتاب لینے والے کا نام مع تصریح سکونت و پیشہ، ضامن کا نام (اجنبی شخص کو بغیر ضمانت کے کتاب نہیں مل سکتی) کتاب کا نام اور فن اور یہ تصریح کہ کتاب مطالعہ کے لئے لیتا ہے یا نقل کے لئے، تعداد ایام، یہ کارڈ خانہ پُری کر کے ملازم کتب خانہ کو حوالہ کر دیا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد کتاب مطالعہ یا نقل کرنے کے کمرہ میں آجاتی ہی یہ طریقہ اگرچہ حسن انتظام کی دلیل ہے، لیکن دقت سے خالی نہیں،

کتابیں جہاں رکھی ہیں، وہ بالکل جداگانہ قطعہ ہے، جس میں متعدد کمرے ہیں، ایک کمرہ جو نہایت وسیع ہے، اس میں نہایت پُر تکلف ترکی قالین بچھا ہے، چاروں طرف دیوار سے ملی ہوئی آئینہ دار الماریاں ہیں، بیچ میں آئینہ دار میزیں ہیں جن کے اندر قلمی اور نادر کتابیں کھلی ہوئی رکھی ہیں، ان میں ایک قرآن ہے جو ہرن کے چمڑے پر لکھا ہے اور جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اسکے سوا

قرآن مجید کے اور نادر نسخے ہیں جو سلاطینِ مصر نے آٹھویں اور نویں صدی میں وقف کئے تھے،

یہ کتب خانہ ۱۲۸۶؁ھ میں قائم ہوا، اسکی مختصر تاریخ یہ ہے کہ قاہرہ و اسکندریہ وغیرہ میں اس سے پہلے بہت سے چھوٹے چھوٹے وقفی کتب خانے تھے اور چونکہ ان کی حفاظت کا کافی انتظام نہ تھا، کتابیں ابتر اور ضائع ہوتی جاتی تھیں اس لحاظ سے علی پاشا ڈائرکٹر سر شتہ تعلیم کی رپورٹ پر یہ کتب خانہ قائم کیا گیا اور تمام قدیم کتب خانوں کی کتابیں اس میں داخل کر دی گئیں، خدیو کے حکم سے علماء کی ایک مجلس قائم ہوئی جس کا یہ کام تھا کہ عمدہ اور نادر کتابوں کا پتہ لگائے تاکہ ان کی نقلیں لکھوا کر کتب خانہ میں داخل کی جائیں، جب کتابوں کا ایک معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا تو خدیو نے فہرست کی تیاری کا حکم دیا، چنانچہ ۱۳۰۰؁ھ میں یہ فہرست شروع ہو کر ۱۳۰۹؁ھ میں انجام کو پہنچی، یہ فہرست آٹھ جلدوں میں ہے اور صرف عربی کتابوں کی ہے، ترکی اور فرنچ اور انگریزی کتابوں کی جدا فہرستیں ہیں،

نقشہ ذیل سے عربی کتابوں کے متعلق ایک اجمالی اطلاع حاصل ہوگی،

نام فن	تعداد کتب	نام فن	تعداد کتب
مصاحف مجید	۱۶۱	حدیث	۱۵۰۳
علم قرأت	۸۵	توحید	۵۶۳
تفسیر	۶۴۷	تصوف	۷۰۵
مواعظ	۳۷۷	الفوائد والادعیۃ	۶۴۴
اصول فقہ	۲۳۵	آداب البحث	۲۰۸

فقہ حنفی	۱۴۵۱	فقہ مالکی	۲۳۷
فقہ شافعی	۵۲۰	فقہ حنبلی	۱۲۶
علم الفرائض	۱۳۸	علم صرف	۲۳۸
نحو	۱۰۲۹	بلاغت	۳۸۵
علم الوضع	۱۸	علم اللغۃ	۱۶۰
عروض والقوافی	۶۸	علم ادب	۱۲۴۹
تاریخ	۱۱۸۴	ریاضی	۱۸۸
علم الہیئۃ	۱۹	علم المیقات	۵۵۴
علم الحروف والاسما	۱۸۵	کیمیا والطبعیہ	۹۸
طب	۴۶۴	منطق	۲۵۶
حکمت وفلسفہ	۱۲۴	فنون متنوعہ	۱۰۹۶
		میزان کل	۱۴۷۰۵

میں اس موقع پر بعض نادر اور نایاب کتابوں کے نام درج کرتا ہوں جو اس کتب خانہ میں موجود ہیں،

تفسیر احکام القرآن لابی بکر الجصاص المتوفی ۳۰۵ھ، احکام القرآن لابن العربی، احکام القرآن لکیا الہراسی المتوفی ۵۰۴ھ، اعراب القرآن للنحاس النحوی المتوفی ۳۳۸ھ، اعجاز القرآن للباقلانی، البحر المحیط لابن حیان الاندلسی، البرہان للشیخ ابی الحسن الاوحدی المتوفی ۳۵ھ فی عشر مجلدات، البسیط للواحدی، تنزیہ القرآن للقاضی عبد الجبار المعتزلی، جامع البیان فی تاویل القرآن لمحمد بن جریر الطبری ۱۲ مجلدات، تفسیر ابن جوزی

۴ مجلدات، تفسیر حافظ عبد الرزاق بن ہمام المتوفی سنہ ۲۱۱ھ، غریب القرآن للسجستانی المتوفی سنہ ۳۳۰ھ، غریب القرآن لاحمد بن محمد الہروی المتوفی سنہ ۴۰۱ھ، غریب القرآن لابن الشحنۃ، قانون التاویل للقاضی ابی بکر ابن المغربی الاندلسی المتوفی سنہ ۵۴۳ھ، التکفیل بمعنی التنزیل للعماد الکندی قاضی اسکندریہ المتوفی سنہ ۷۰۱ھ،

حدیث الاحکام الکبری لعبد الحق الاشبیلی، اختلاف الحدیث للامام الشافعی، آداب للامام الحافظ بیہقی، جامع المسانید والالقاب لابن الجوزی، الجوہر النقی، الحاوی فی بیان آثار الطحاوی، سنن کبری بیہقی، شرح معانی الآثار للعینی، مسند امام حنبل، مسند امام راہویہ، مسند حافظ ابی عوانہ، مسند حافظ ابو عبد اللہ المروزی، مسند حافظ ابو نعیم،

تاریخ، احاطہ فی اخبار غرناطہ، اخبار ابی نواس عدد اوراقہا ۱۲۰، اخبار سیبویہ النحوی اوراقہا ۳۶- الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبۃ اوراق صوفی ناقص، تاریخ دمشق لابن عساکر ناقص، تاریخ بغداد خطیب ناقص، تاریخ الحکماء لجمال الدین القفطی، طبقات الامم لصاعد الاندلسی، مسلم الوصول الی طبقات الفحول لمصنف کشف الظنون، السہم المصیب فی الرد علی الخطیب، طبقات الحفاظ للذہبی، طبقات کبری سبکی، طبقات الشافعیۃ، طبقات الشعراء لابن قتیبہ، طبقات الفقہاء امام ابو اسحق شیرازی، طبقات ابن سعد، تاریخ علمی، طبقات حملۃ المذہب لابن الملقن، فضائل ابی بکر الصدیق لابن العشاری من اصحاب القرن الخامس، فضائل ابی حنیفۃ النعمان لابن العوام، فضائل مصر لابن یوسف الکندی المتوفی سنہ ۳۵۰ھ منقولہ من نسخۃ الاصل المکتبۃ لکافور الاخشیدی، اللباب فی الانساب لابن الاثیر، مناقب الشافعی، مختصر المنتظم لابن الجوزی واختصارہ ایضاً، مسالک الامصار لابن فضل اللہ،

مناقب الامام الشافعی للرازی، مناقب امام احمد حنبل لابن الجوزی، سیرۃ الفاروق
لابن الجوزی، المنتظم لابن الجوزی، نہایۃ الارب للنویری ناقص،
ادب، الاشباہ والنظائر، البیان والتبین للجاحظ، جمہرۃ اشعار العرب ابن
درید حماسۃ البصریین، دیوان حافظ ابن حجر، دیوان ابن الرومی، دیوان ابن المعتز،
دیوان ابی نواس، دیوان الاعشیٰ، ذوالرمہ، دیوان قطامی، دیوان قیس بن الخطیم
دیوان لبید، دیوان المتلمس، روضۃ البلاغۃ، الزاہر للزجاجی، شرح ابن جنی علی المتنبی
شرح دیوان ابی تمام للصولی المتوفی ۳۳۵ھ شرح دیوان جران العود ملامام العسکری
المتوفی ۲۷۵ھ، شرح دیوان حطیہ، شرح مرزوقی علی حماسہ شرح الحماسہ لابی العلاء
المعری، شرح دیوان حماسہ لابن جنی، شرح دیوان خریق وہی مشاعرۃ جاہلیۃ، شرح
دیوان زہیر بن ابی سلمیٰ للامام ثعلب، شرح دیوان زہیر للاعلم الشنتمری، شرح عبید اللہ
ابن قیس والرقیات العسکری، شرح دیوان المنتقب العبدی وہو جاہلی شرح المعلقات
لابن النحاس، شرح المفضلات لابن الانباری، دیوان سراقہ بن مرداس، دیوان شماخ
دیوان عمر بن ابی ربیعہ، شرح دیوان روبۃ، شرح دیوان العجاج، دیوان داؤد الدمشقی

———— ۰ ————

قدیم یادگاریں اور قابلِ سیر مقامات

آثار قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کرسکتا، سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے، سواد شہر کے ویرانوں میں اس وقت تک سینکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں، جن پر کئی کئی ہزار قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں، مجھ کو اتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے کہ اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا، البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور انہی کے حال پر اکتفا کرتا ہوں،

اہرام، یہ وہ قدیم مینار ہیں، جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفانِ نوحؑ سے پہلے موجود تھے، اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے کہ یونان کی علمی ترقی سے انکی عمر زیادہ ہے، کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ مینار نہایت کثرت سے تھے یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے، صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیئے گئے، ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں، اور جن پر خاص طور سے اہرام کا اطلاق ہوتا ہے، صرف تین ہیں، جو سب سے بڑا ہے، اسکی لمبائی ۴۸۰ فٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دگنی ہے، نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع ۷۶۴ فٹ ہے، مینار کا مکعب ۸ کرور نوے لاکھ فٹ ہے، اور وزن ۶۰ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے، جڑیں ۳۰۔۴۰ فٹ لمبے اور ۵۔۵ فٹ چوڑے پتھر کی چٹانیں ہیں، اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں ۸ فٹ کی ہیں، اسکی شکل یہ ہے، ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے، اس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر

دوسرا چبوترہ ہے، اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں، اور ان چبوتروں کے
بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ پتھروں
کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا تو ایک طرف چونہ یا مصالح کا بھی اثر
نہیں معلوم ہوتا، اس پر استحکام کا یہ حال ہے کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال
برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے، ان میناروں کو دیکھکر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جر ثقیل کا
فن قدیم زمانہ میں موجود تھا، کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جر ثقیل کے بغیر
چڑھائے نہیں جا سکتے اور اگر اس ایجاد کو زمانہ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو جر ثقیل
سے بھی بڑھکر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑیگا،

ان میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہی، کسی قدر خراب ہو گیا ہے، جس کی کیفیت
یہ ہے کہ ۵۹۳ھ ہجری میں ملک العزیز (پسر سلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی
ترغیب سے اس کو ڈھانا چاہا، چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن
اور سنگ تراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے، آٹھ مہینہ تک برابر کام جاری رہا
اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں، ہزاروں لاکھوں روپیے برباد کر دیئے گئے لیکن
بجز اس کے کہ اوپر کی استر کاری خراب ہوئی یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اکھڑ گیا اور
کچھ نتیجہ نہیں ہوا، مجبور ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا،[1]

اہرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے، جس کو یہاں کے لوگ ابوالہول
کہتے ہیں، اس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے، گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھلے ہوئے
ہیں، چہرہ پر کسی قسم کا سرخ روغن ملا ہے، جس کی آب اس وقت تک قائم ہی، ان اعضا

[1] اس واقعہ کو عبد اللطیف بغدادی نے مصر کی تاریخ میں افسوس کے ساتھ درج کیا ہی،

کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہی، کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہ ہوگا، باوجود اس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں، کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں، عبد اللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا کہ "آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی،، اُس نے کہا کہ "ابوالہول کے اعضا کا تناسب،، کیونکہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں، اس میں ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں،

قلعہ، یہ قلعہ سلطان صلاح الدین کے عہد کا ہی، قلعہ کی اصل عمارت میں نہیں دیکھ سکا، البتہ محمد علی پاشا کی مسجد دیکھی، بڑی شان و شوکت کی ہے، چھت اور دیواروں پر طلائی نقش و نگار ہیں، تمام مسجد میں نہایت عمدہ ترکی قالین کا فرش ہی، مسجد کے قریب وہ عجیب و غریب کنواں ہی، جس کو عوام نے چاہِ یوسف اور زندانِ یوسف مشہور کر رکھا ہے، اور لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں، چونکہ سلطان صلاح الدین کا اصل نام یوسف ہے، اس لئے مجاوروں کو عوام کے بہکانے کا اچھا ذریعہ ہاتھ آگیا ہے، لطف یہ ہے کہ اس میں ایک قبر بنا رکھی ہے، اور اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بتاتے ہیں، مجاور صاحب نے مجھ کو بھی دھوکہ دینا چاہا، اور جب میں نے کہا کہ حضرت یوسفؑ یہاں کہاں ہ؟ تو برجستہ فرمایا کہ "مجھ کو سہو ہوا یہ اس قیدی کی قبر ہے جو حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید خانہ میں داخل ہوا تھا، اور اُن سے خواب کی تعبیر پوچھی تھی،

یہ کنواں درحقیقت عجیب و غریب ہے، اس کے عمق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ (۳۰۰) سیڑھیاں اتر کر اس کی جگت ملتی ہی، سیڑھیاں بڑے کج و پیچ سے بنائی گئی ہیں، اور راستہ اس قدر تاریک ہے کہ بغیر شمع کے کچھ نظر نہیں آسکتا، چنانچہ

جو لوگ اس کی سیر کو جاتے ہیں، مجاور شمع لے کر ان کے ساتھ ہوتا ہے، جگت پر پہونچ کر میں نے کنکری پھینکی تو دیر کے بعد اُس کی آواز آئی، جس سے معلوم ہوا کہ پانی بہت فاصلہ پر ہے،

اینٹیک خانہ، یعنی عجائب خانہ، یہ عجائب خانہ محمد علی پاشا خدیو مصر نے سنہ ۱۸۳۵ء میں قائم کیا، شہر سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر سرکاری باغ ہے جو کئی میل لمبا چوڑا ہے، عجائب خانہ اسی میں واقع ہے، اس میں بے شمار کمرے ہیں اور نہایت خوبصورتی سے مرتب ہیں، یہاں حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے کی یادگاریں موجود ہیں، تشتریاں، پیالے، مرتبان اور اس قسم کے سینکڑوں برتن ہیں جو کئی کئی ہزار برس کے ہیں، سب سے عجیب وغریب وہ لاشیں ہیں جن پر ہزاروں برس گذر چکے اور اب تک اصلی ہیئت کے ساتھ قائم ہیں ان کو عربی میں مومیائی اور انگریزی میں ممی کہتے ہیں، قدیم مصریوں کا دستور تھا کہ لکڑی یا پتھر کو کشتی کی وضع پر تراش کر اس میں مردوں کی لاشیں رکھتے تھے، اور خالی جگہ کو چونہ وغیرہ سے بھر کر اوپر کی سطح پر مردہ کی تصویر بنا دیتے تھے، لاشوں میں ایک خاص قسم کا مصالحہ لگایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے بدن سڑنے گلنے سے محفوظ رہتا تھا، اس قسم کے بہت سے تابوت یہاں موجود ہیں اور انہی کو مومیائی یا ممی کہتے ہیں، ان میں سے دو یا تین تابوت کھل گئے ہیں، یعنی اوپر کا چونہ اور مصالحہ ہٹ گیا ہے، اور اس وجہ سے تمام جسم صاف نظر آتا ہے، میں نے بہت غور سے ان لاشوں کو دیکھا باوجود ہزاروں برس گذرنے کے جسم پر بوسیدگی کا ذرا بھی اثر نہیں، سر کے بال اور ناخن بدستور قائم ہیں، ان کو دیکھ کر دل پر عجیب تاثیر ہوتی ہے، اور درحقیقت ان سے بڑھ کر عبرت کا مرقع اور کیا ہوگا؟

سجن یوسف۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا قید خانہ، یہ ہی قید خانہ ہی، جس کا ذکر قران مجید میں ہی اور جو حضرت یوسف عم کے جمالِ مبارک کی وجہ سے رشک ارم تھا،

در چمن بود زلیخا و بہ حسرت می گفت   یاد زنداں کہ درو انجمن آرائے ہست

علامہ مقریزی نے لکھا ہی کہ "صحیح روایات اور قرائن سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف عم جس قید خانہ میں قید ہوئے تھے وہ یہی مقام ہے، مجھ کو سخت افسوس ہی کہ میں اس عبرت انگیز اور متبرک مقام کی سیر نہ کر سکا، میں نے اس کا تذکرہ صرف اس وجہ سے کر دیا ہے، کہ ہمارے ہموطنوں میں سے خدا کسی کو یہاں پہنچائے تو میری طرح اسکی زیارت سے محروم نہ رہے،

اسلامی قدیمی یادگاریں بھی یہاں کثرت سے ہیں، مسجدوں کی تو کچھ انتہا نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہیں، ان میں سب سے قدیم جامع عمرو بن العاص ہے جو حضرت فاروق رض کے عہدِ خلافت کی یادگار ہی، مشہد حسین ایک مسجد ہے، جس کی نسبت مشہور ہے، کہ حضرت امام حسین عم کا سر مبارک اس میں مدفون ہی، معلوم نہیں کہ یہ روایت کہاں تک صحیح ہے، لیکن یہاں کے عام لوگ اسی بنا پر مسجد کا نہایت احترام کرتے ہیں، حکومت کی طرف سے بھی اس کے لئے بڑا اہتمام ہے، شاندار، وسیع اور خوبصورت مسجد ہے، اس پر تکلف اور ساز و سامان نے اور بھی اس کی رونق بڑھا دی ہی، تمام مسجد میں ٹرکی قالین بچھا ہوا ہے اور غالباً بہت جلد جلد بدلا جاتا ہی، کیونکہ میں نے جب دیکھا تو کہنگی اور فرسودگی کا مطلق اثر نہ تھا،

سب سے زیادہ عجیب و غریب مسجد۔ سلطان حسن کی مسجد ہے جو قلعہ کے قریب ہی، اس مسجد کی تعمیر میں متصل تین برس تک بیس لاکھ درہم (پانچہزار روپیے) روزانہ صرف

ہوئے ۷۵۷ھ میں اسکی تعمیر شروع ہوئی اور ۷۶۰ھ میں انجام کو پہنچی، اس کو مدرسۂ سلطان
حسن بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے چار طرف بڑے بڑے ایوان ہیں، جن میں ائمۂ اربعۂ
کے فقہاء فقہ و حدیث کا درس دیتے ہیں، مورخ مقریزی نے لکھا ہے کہ "تمام ممالک اسلام
میں کوئی مذہبی عمارت اس کے مثل تعمیر نہیں ہوئی"! اگرچہ میں اس دعوی کو تسلیم نہیں کر سکتا،
لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ دنیا کی کوئی مسجد اس قدر بلند اور مرتفع نہیں ہے، افسوس
اور سخت افسوس ہے کہ ایسی عجیب و غریب یادگار بالکل ویران ہو رہی ہے، رات کو
اس میں چراغ تک نہیں جلتا، اور دروازہ ہر وقت بند رہتا ہے، میں دروازہ کھلوا کر
اندر گیا تو ہر طرف وحشت برستی تھی، اسلامی سلطنت میں ایسی عظیم الشان مسجد کی
یہ بے قدری نہایت قابلِ تعجب ہے،

مزارات اور مشاہد بھی کثرت سے ہیں، اور ان کے مصارف کے لئے بہت سے
اوقاف ہیں، حضرت زینبؓ (حضرت امام حسین علیہ السلام کی بہن) حضرت کلثومؓ
امام شافعیؒ، امام لیثؒ کے مقبرے بڑی شان و شوکت کے ہیں، میں نے امام شافعیؒ
کے مزار کی زیارت کی، اور مزارات کی زیارت کا بھی ارادہ تھا، لیکن وہاں پہنچکر جو
حالت دیکھی اس سے طبیعت کو وحشت ہوئی، اور متاسف ہو کر واپس آیا، مصر والوں
نے ہفتہ کے خاص خاص دن قرار دے رکھے ہیں جن میں ان کے اعتقاد کے موافق
حضرت زینبؓ و امام شافعیؒ وغیرہ کی روحیں عالمِ بالا سے اپنے مزارات کی طرف
متوجہ ہوتی ہیں، ان خاص دنوں کو حضرۃ کہتے ہیں، اور جس کے حضرۃ کا جو دن ہوتا
ہوتا ہے اس دن ان کے مزار پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے، کثرت سے لوگ زیارت
کو آتے ہیں، اور قبر کو بوسہ دے کر اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں،

اس وقت لوگوں کی جو حالت ہوتی ہے، اس میں شرک وبت پرستی میں اگر کچھ فرق ہے تو ایسا دقیق ہے کہ مجھ جیسے ظاہر بیں کو نظر نہیں آسکتا تھا، مجھکو ہندوستان ہی کی قبر پرستی کا رونا تھا، لیکن مصر پہنچ کر تمام اسلامی دنیا کی نسبت یہ شعر یاد آیا،

زپاے تابسرش ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

قدیم زمانہ کے مدرسے جن کا اجمالی ذکر میں نے گذشتہ تعلیم میں کیا ہے، اب بھی موجود ہیں، لیکن ویران ہوتے جاتے ہیں، راہ چلتے چلتے اتفاق سے ایک مدرسہ میں میرا گذر ہوا، اگرچہ وہ محض ایک معمولی مدرسہ تھا، لیکن عمارت خوش نما اور بہت اونچی تھی، چاروں طرف طالب علموں کے رہنے کے کمرے، بیچ میں صحن، صحن میں دو ایک کیاریاں اور کھجور کے چند درخت ہیں، غرض اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا، کہ چھوٹے سے مدرسہ کا ویران ہونے پر یہ حال ہے تو بڑے بڑے مدرسے زیادہ پُرشان، موزوں اور خوبصورت رہے ہوں گے،

مطابع واخبارات

چونکہ مصر کی مطبوعہ کتابیں تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئیں ہیں اور عربی کتابوں کے چھاپنے اور پھیلانے میں مصر نے عام ناموری حاصل کی ہے، اس لئے ان مطبعوں اور یہاں کے کتب فروشوں کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے،

مطابع یہاں نہایت کثرت سے ہیں اور بعض بعض قابلِ تعریف ہیں، بالخصوص بلاق کا سرکاری مطبع عظیم الشان مطبع ہے، اور صحت وصفائی وخوبی کاغذو

عمدگیِ طبع کے لحاظ سے اپنا آپ نظیر ہے، یہ مطبع ۱۸۲۰ئہ میں محمد علی پاشا کے حکم سے قائم ہوا، اور اُس وقت اس میں چار سو آدمی کام کرتے تھے اب بھی نہایت رونق پر ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ملک کے مذاق کے خراب ہو جانے کی وجہ سے عمدہ اور نادر المضمون کتابیں کم چھپتی ہیں، کتب خانہ خدیویہ میں جو نایاب قلمی کتابیں موجود ہیں، ان میں سے اگر سو دوسو کتابیں بھی چھاپ دیجائیں تو دنیا معلوماتِ مفیدہ سے مالا مال ہو جائے، میں نے بعض روشن ضمیر مطبع والوں سے اس باب میں گفتگو کی، انھوں نے جواب دیا کہ اس قسم کی کتابیں عام پسند نہیں، عام پسند کتابیں البتہ بار بار چھپتی ہیں، اور بک جاتی ہیں، مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف جو آٹھ برس پہلے چھپی تھی اسکی جلدیں آج تک نہیں نکلیں، افسوس اور شرم کی بات ہے کہ کتب خانہ خدیویہ کی نادر کتابیں یورپ جاکر چھپتی ہیں، اور وہاں سے شائع ہوتی ہیں، سید عبدالواحد طوبی ایک مشہور تاجر ہیں، یورپ والوں نے ان سے معاملہ کر رکھا ہے، وہ ان کے حسب فرمایش کتابوں کی نقل لکھواکر یورپ کو بھیجتے ہیں، چنانچہ سید عبدالواحد نے مجھکو تین چار کتابوں کے قلمی اجزا دکھلائے جو انھوں نے یورپ بھیجنے کے لئے نقل کرائے تھے

البتہ مصر کا یہ احسان ہے کہ کتابیں نہایت ارزاں ہیں جس کی وجہ سے انکا نفع بہت عام ہے، میں نے بہت سی کتابیں خریدیں جو نولکشوری مطبوعات سے بھی کم قیمت تھیں، جن لوگوں کو مصر کی کتابیں مطلوب ہیں، ان کو چاہیئے کہ براہ راست مصر سے منگوائیں، بمبئی سے نہ منگوائیں، جہاں کے تاجر چوگنے نفع پر بھی قناعت نہیں کرتے، مصر کی کتابوں کے لئے سید عبدالواحد طوبی سے خط وکتابت کرنی چاہیئے، ان کا پتہ یہ ہے، مصر قاہرہ، قریب الجامع الازہر، روپیے منی آرڈر کے ذریعہ سے بے تکلف

بھیجے جا سکتے ہیں،

اخبارات جو عربی زبان میں نکلتے ہیں تیس سے اوپر ہیں، ان میں المؤید، المقطم، التقدم، اہرام زیادہ نام آور ہیں، ان کے علاوہ ۲۵ - ۳۰ اخبارات اور رسالے فرنچ اور انگریزی زبان میں نکلتے ہیں،

انگریزی گورنمنٹ کی بدولت یہاں کے اخباروں کو آزادی حاصل ہے، اس لئے یہ اخبارات ہر قسم کے معاملات پر نہایت آزادی سے لکھتے ہیں، اور خوب لکھتے ہیں، چونکہ عربی زبان میں پالٹیکس پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور ہمارے ہندوستان کے علما، اس قسم کے مضامین پر چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتے، اس لئے بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ پالٹیکس کے خیالات اس زبان میں پوری طرح ادا ہی نہیں ہو سکتے، لیکن مصر کے اخبارات نے اس خیال کو قطعاً باطل کر دیا ہی،

ماہوار رسالے بھی متعدد ہیں اور بعض بعض بڑی قابلیت سے شائع ہوتے ہیں، ان میں سے مقتطف اور الہلال زیادہ کامیاب ہیں، الہلال ہمارے لجنۃ الادب[1] میں آتا ہے، آٹھ روپیے سالانہ قیمت ہے، میں سفارش کرتا ہوں کہ اور ارباب ذوق بھی اسکی خریداری فرمائیں اور فائدہ اُٹھائیں،

---

[1] یہ ایک انجمن ہے جو ہمارے مدرسۃ العلوم میں ڈیڑھ سال سے قائم ہی، ہر مہینہ میں اسکے تین چار اجلاس بحث طلب مضامین پر ہوتے ہیں اور جس قدر تقریریں اور اسپیچیں کی جاتی ہیں، عربی زبان میں کی جاتی ہیں بلکہ اس کی تمام کارروائی عربی زبان ہی میں ہوتی ہی، شاید تمام ہندوستان میں اس قسم کی یہ پہلی مجلس ہی، ہمارے قدیم مدارس عربیہ کو اس انجمن کی تقلید کرنی چاہیئے،

تھیٹر

تھیٹر یہاں دو تین ہیں، ایک سرکاری ہے جو خدیو اسمعیل پاشا کے عہد میں تعمیر ہوا تھا، یہ بڑے تکلف اور شان وشوکت کا ہے، لیکن اس زمانہ میں بند تھا، اس لئے میں اس کی سیر نہ کرسکا، ایک اور تھیٹر ہے، جو کسی عیسائی کمپنی کا ہے، میں نے ایک دفعہ اسکی سیر کی، پردے اور سازوسامان اچھے ہیں، تماشا یہ تھا کہ نیوبیادیا، یونان (مقام یاد نہیں) کی ملکہ اور قیصر روم میں حدود مملکت کے متعلق جھگڑا ہے، قیصر نے ملکہ سے بعض نئے ممالک طلب کئے، ملکہ نے انکار کیا، اس پر دو تین بار رد و بدل ہوئی، یہانتک کہ جنگ چھڑ گئی اور بڑا معرکہ ہوا، عورت جو ملکہ بنی تھی اس کا لباس بالکل یوروپین تھا، کمر میں ننگی تلوار تھی اور نہایت زیب دیتی تھی، ایکٹ بھی اس نے خوب ادا کیا تھا، قاصد سے قیصر کا پیغام سنکر اس کا تڑپ کر اُٹھنا، تلوار کو جنبش دینی اور پُرغیظ لہجہ میں یہ الفاظ کہنے کیف ترضی بھذا الذل والھون ، ساتھ ہی عرب جاہلیۃ کے چند فخر آمیز اشعار کا پڑھنا واقعی عجیب اثر پیدا کرتا تھا، اشعار اس نے گائے نہیں تھے، بلکہ غیظ اور ادعا کے لہجہ میں ادا کئے تھے، لڑائی کے وقت دونوں فوجیں ہاتھوں میں تلواریں لیکر دست بدست لڑیں، تلواروں کے وار صاف نظر آتے تھے، اور جو لوگ زخمی ہو ہو کر گرتے تھے، ان کی لڑکھڑاہٹ اور بے اختیار زمین پر گرنے سے معلوم ہوتا تھا، کہ واقعی زخمی ہوکر گرتے ہیں، سب سے زیادہ مجھ کو جو چیز پسند آئی وہ یہ تھی کہ اخیر میں سب نے خدیو کی سلامتی کا گیت گایا، پورا گیت یاد نہیں، مگر یہ الفاظ ضرور تھے، العیش تم والنفع عم من الخدیو المحترم اسی طرح اور متعدد

ہم قافیہ الفاظ تھے، ہر ہر فقرہ پر آواز کا چڑھاؤ اتار، عربی لہجہ کے ساتھ نغمہ طرازی، اصولِ موسیقی کا لحاظ اور سب سے بڑھکر یہ خیال کہ اس جوش سے خدیو کی سلامتی کا راگ گانے والے سب عیسائی ہیں، میرے دل پر عجیب اثر کرتا تھا،

تھیٹر، ہندوستان کا ہو، خواہ عرب اور مصر کا، میرے نزدیک اسکی شرکت وقار و شایستگی کے خلاف ہے، لیکن اسلامی سلطنت کی ہر چیز عزیز معلوم ہوتی تھی،

شعر

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل ہیں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کلب و انجمنیں

انجمنیں یہاں کثرت سے ہیں اور اُن کے مختلف مقاصد ہیں، ۹ خیراتی ہیں جن کا مقصد غریبوں کی امداد و اعانت ہے، لیکن تعجب ہے کہ ان میں ایک بھی مسلمانوں کی نہیں، علمی انجمنیں بھی متعدد ہیں، جن میں جمعیۃ العلماء المصریۃ جو ۱۸۵۹ء میں قائم ہوئی، اور المجمع العلمی الجغرافی جس کو خدیو اسمٰعیل پاشا نے ۱۸۷۵ء میں قائم کیا[1]، زیادہ نامور اور فائدہ رساں ہیں، ڈیبیٹنگ کلب یعنی مناظرہ کی مجلسیں نہایت کثرت سے ہیں اور ان کی وجہ سے مصریوں نے لکچر و اسپیچ کے فن میں بہت ترقی کی ہے، ایک مجلس میں میں خود شریک ہوا، صدر کی جانب ایک بلند چبوترہ تھا، جس پر صدر انجمن اور سکریٹری کی کرسیاں بچھی تھیں، عام حاضرین بنچوں پر تشریف فرما تھے، میرے سامنے

---

[1] اس انجمن نے جغرافیہ کے متعلق نہایت نادر تحقیقات اور معلومات فراہم کیں، جو مستقل رسالہ کی صورت میں چھپ کر شائع ہوئی ہیں، اس انجمن کا ایک خاص مکان اور کتب خانہ اور دیگر لوازمات ہیں،

چار پانچ شخصوں نے گفتگو کی، ان کی تقریریں ایسی برجستہ، پُر زور اور فصیح تھیں کہ مجھ پر ایک حیرت سی طاری تھی، تعجب یہ ہے کہ مصریوں کی عام بول چال نحو کے لحاظ سے محض غلط بلکہ بے معنی ہوتی ہی، لیکن اس قسم کے موقعوں پر نہایت شستہ عربی بولتے ہیں، اور تکلف و آورد کا نام نہیں ہوتا، اس قسم کی مجلسوں اور اخبارات کی آزادی کی وجہ سے مصریوں میں جو عام زندہ دلی، آزادیٔ خیالات، جرات اور حوصلہ مندی پیدا ہو گئی ہے، ٹرکی ممالک بلکہ کل موجودہ اسلامی حکومتوں میں اس کا پرتو تک نہیں،

مولد نبویؐ

مصر والوں کو حقیقت میں اس بات پر ناز کرنا چاہئیے، کہ مولد کے اصلی معنی اگر سمجھے تو انہی نے سمجھے، یہاں مولد کا طریقہ یہ ہے کہ شہر سے باہر ایک وسیع خطۂ زمین ہے جس کو ایک معزز خاتون نے اسی کام کے واسطے وقف کر دیا ہے، اس میدان میں تین طرف نہایت ترتیب اور سلیقہ سے خیمے اور شامیانے نصب ہوتے ہیں، اور بیچ کی زمین بطور صحن کے چھوڑ دی جاتی ہے، صحن بالکل دائرہ کی ہیئت میں ہوتا ہے، اور اس کے ہر چہار طرف سرخ جھنڈیاں کھڑی کی جاتی ہیں خیمے اور شامیانے چونکہ عموماً پاشاؤں اور امرار کے ہوتے ہیں، نہایت تکلف اور نفاست سے آراستہ کئے جاتے ہیں، ہر پاشا اور امیر اپنا خیمہ جداگانہ طرز سے آراستہ کرتا ہے، جھاڑ و فانوس کی روشنی ہوتی ہے، اور کثرت سے ہوتی ہے، ہر خیمہ میں شربت یا چائے یا اور کوئی اس قسم کی چیز ہر وقت مہیا رہتی ہے، جس وقت کوئی شخص اگرچہ وہ عام تماشائی ہو خیمہ میں داخل ہوتا ہے، فوراً چائے یا شربت سے اس کی تواضع کی جاتی ہے،

خدیو کا خیمہ جس میں ان کی طرف سے ان کا نائب شریک ہوتا ہے، سُرخ ہوتا ہے اور نہایت پُرشان اور پُر رونق ہوتا ہے، ہر خیمہ میں خاص خاص گروہ کے فقرا اور صوفی جمع ہوتے ہیں، اور اپنے اپنے طریقہ کے موافق ذکر کرتے ہیں، ذکر کا طریقہ ہندوستان کے فقرا سے بالکل جدا ہے، سب لوگ حلقہ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور ذکر کے خاص الفاظ ایک ساتھ بلند آواز سے کہتے ہیں ان الفاظ کے ساتھ رکوع کے قریب جھک کر کمر اور گردن کو عجیب طور پر حرکت دیتے ہیں، اگر کوئی شخص دور سے دیکھے تو اس کو ورزش کا دھوکا ہو، درویشان رقاص کا طریقہ اور بھی عجیب ہے، اور سچ یہ ہے کہ فقر و تصوف کی تضحیک و توہین ہے، ان لوگوں کا لباس ایک خاص وضع کا ہوتا ہے پوری ہیئت تو خیال میں نہیں لیکن اس قدر یاد ہے کہ نیچا جامہ اور کمر میں سبز ٹپکا ہوتا ہے، یہ لوگ صف باندھکر بیٹھتے ہیں اور ان میں جو شخص ذکر کرنا چاہتا ہے وہ وسط محفل میں جاکر ناچنا شروع کرتا ہے، لوگوں کا بیان ہے کہ ناچ کے تمام اصول ادا کئے جاتے ہیں لیکن میں نے جو دیکھا اسی قدر تھا کہ وہ شخص ایک جگہ کھڑا ہو کر پھرکی کی طرح چکر لگاتا تھا، قریبًا ایک گھنٹہ اسی طرح ناچتا رہا، لیکن ہاتھ یا کسی اور عضو کو حرکت نہیں ہوتی تھی، ایک اور گروہ تھا، جس کا طریقہ کسی قدر اس سے مختلف تھا، ان لوگوں کے جامے اونچے اور زیادہ گھیر دار تھے، قریبًا جس طرح گھاگھرہ والی پلٹن، ناچنے کے وقت یہ لوگ دونوں ہاتھ پھیلا کر ناچتے تھے۔

مجھ کو سخت افسوس ہوا کہ اس بیہودہ طریقہ کو یہ لوگ عبادت سمجھتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ لوگ غوث، قطب، ابدال، اوتاد کے رتبہ تک ترقی کرتے ہیں، ع وللناس فیما یعشقون مذاہب،

درویشانِ رقاص کا ذکر ضمناً آگیا تھا، اب میں اصل واقعہ یعنی مولد کی کیفیت کی طرف رجوع کرتا ہوں، پہلی تاریخ سے یہ اجتماع شروع ہوتا ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ بارہویں کی شب کو اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ کشمکش سے جگہ نہیں ملتی، صبح کو سب لوگ خصوصاً نائب الحکومت، قاضی، مفتی، شیخ الازہر مشہد حسین میں جمع ہوتے ہیں اور ایک عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے حالات پڑھتا ہے، ولادت کے ذکر کے وقت معمول کے موافق قیام ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہوجاتی ہے جس کے ساتھ مولد کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے،

مولد کا یہ طریقہ اس لحاظ سے مجھ کو بہت پسند آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت پر جس جوش اور مسرت کا اظہار ہونا چاہئے، وہ اسی طریقہ سے ہونا چاہئے، چھوٹی چھوٹی مجلسوں میں یہ اجتماع، شان و شوکت، سروسامان کہاں؟ لیکن دو تین باتیں قابلِ اعتراض ہیں، اول یہ کہ گیارہویں اور بارہویں کو آتشبازی ہوتی ہے اور یہ امر ایسی مقدس رسم کے شایاں نہیں، دوسرے یہ کہ لوگوں کا اجتماع دیکھکر اس مجمع کے قریب سڑکوں پر تھیٹر وغیرہ قائم ہوجاتے ہیں، حکومت کو چاہئے کہ ان کو قطعاً روک دے،

اہلِ کمال اور مفید تصنیفات

قسطنطنیہ کی طرح یہاں بھی علما و مصنفین کے دو گروہ ہیں، اور دونوں کا مذاق بالکل الگ الگ ہے، ازہر کے شیوخ اور تلامذہ میں سے بعض بعض اپنے فن یعنی نحو و فقہ میں کامل خیال کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے کمال کا تمام تر مدار صرف جزئیات کے حفظ پر ہے، جس میں تحقیق و اجتہاد کا شائبہ نہیں، خود شیخ ازہر جن کو امام الفن کہا جاتا

ہے، کسی فن میں ان کی کوئی محققانہ تصنیف نہیں، نئی تعلیم نے بھی اگرچہ اب تک کوئی صاحب کمال نہیں پیدا کیا، لیکن اس میں تحقیق و اجتہاد کی جھلک پائی جاتی ہے، اور تصنیفات میں یورپ کا انداز ہے، میں ان دونوں گروہوں میں سے بعض مشاہیر کا حال لکھتا ہوں،

علی پاشا مبارک

مصر کے سر رشتہ تعلیم میں جو کچھ اصلاح و ترقی ہوئی ہے، انہی کی بدولت ہوئی ہے، سولہ برس کی عمر تھی کہ یہ ۱۲۵۵ھ میں مدرسہ مہندس خانہ میں داخل ہوئے، ۱۲۶۰ھ میں محمد علی پاشا کے بیٹوں کے ساتھ فرانس کا سفر کیا اور کئی برس وہاں رہکر متعدد ڈگریاں حاصل کیں، ۱۲۸۰ھ میں انکو دفتر مدارس اور نظارت اوقاف کی خدمت سپرد ہوئی، اسی زمانہ میں انھوں نے بہت سے علمی کام کئے، خانگی مکاتب کی اصلاح کی، اضلاع میں صدر مدارس قائم کئے، دار العلوم کی بنیاد ڈالی، کتبخانہ خدیویہ قائم کیا، ۱۲۸۵ھ میں ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوئے، اور تعلیم کو نہایت ترقی دی، خود بھی صاحب تصنیف و تالیف ہیں، مقریزی کی خطط و آثار کا نہایت عمدہ تکملہ لکھا ہے، شہنشاہ فرانس اور شاہ آسٹریا نے انکو اعزاز کے تمغے بھیجے ہیں، میں انکی ملاقات کا بہت شائق تھا، لیکن بدقسمتی سے اس زمانہ میں خدیو کے ساتھ اسکندریہ چلے گئے تھے، تین چار مہینے ہوئے انھوں نے انتقال کیا، ان کے جنازہ میں تمام اعیان سلطنت شریک تھے، حال میں ان کی سوانحعمری لکھی گئی اور شائع ہوئی ہے،

علی پاشا ابراہیم

یہ نہایت روشن ضمیر تعلیم یافتہ شخص ہے، ۱۲۶۰ھ میں تعلیم کی غرض سے فرانس

گیا اور پانچ برس رہکر اعلیٰ درجہ کی ڈگری حاصل کی، ۱۲۹۶ھ میں ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوا، معلّمین کے مدارس اوّل اسی نے قائم کئے، سلطنت فرانس نے اس کو اوفیسر کے درجہ کا تمغہ بھیجا جو مشہور اہلِ کمال کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا،

امین بک فکری

ہائی کورٹ کے جج ہیں، فرانس میں تعلیم پائی ہے، سوئڈن میں جو اورنٹیل کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں سلطنت مصر کی طرف سے وکیل مقرر ہو کر گئے تھے، چنانچہ حالاتِ سفر میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کے دیکھنے سے ان کی قوتِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کی قیمت آٹھ روپیہ ہے، اور واقعی قابلِ سیر کتاب ہے،

احمد زکی

محکمۂ ترجمہ کے سکریٹری ہیں، فرنچ نہایت عمدہ جانتے ہیں، غلامی کے مسئلہ پر ایک رسالہ فرنچ میں لکھا تھا جو نہایت مقبول ہوا اور فرانس کے مشہور اخبارات اور اربابِ تصنیف نے اس پر آرٹکل اور ریویو لکھے، چنانچہ اصل رسالہ معہ ریویو وغیرہ کے عربی میں ترجمہ ہو کر چھپا ہے، جس کا نام الرق فی الاسلام ہے، ان کی اور بھی مفید تصنیفات ہیں، لندن میں جو اخیر اورنٹیل کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں یہ وکیل مقرر ہو کر گئے تھے،

شیخ محمد عبدہٗ

پرانے تعلیم یافتہ ہیں، فن ادب میں تمام مصر و شام ان کو استاد الفن تسلیم کرتا ہے،

مقامات بدیع کی شرح نہایت قابلیت سے لکھی ہی، روشنضمیری کے ساتھ نئے مذاق سے آشنا ہیں جس کا سبب سید جمال الدین افغانی کا فیضِ صحبت ہے، سید موصوف کے ایک سالہ کا عربی میں ترجمہ کیا ہے، اور اس کے دیباچہ میں مختصر طور پر ان کی سوانحعمری لکھی ہے، میں اس کے بعض فقرے اس مقام پر لکھتا ہوں جس سے شیخ موصوف کی مہارتِ فن اور زورِ تحریر کا اندازہ ہوگا، ہمارے ملک میں جو لوگ فن ادب کو لئے بیٹھے ہیں، ان کو اس طرز کی تقلید کرنی چاہیئے، اور واقعات نگاری کا یہ اسلوب اختیار کرنا چاہئے جہاں سید موصوف (جمال الدین افغانی) کے حلیہ اور اخلاق و اوصاف کا ذکر کیا ہی وہاں لکھا ہی

اما خلقه فیمثل لناظر عربیا محضا ربعة فی طوله وسطا فی بنیة قمحی فی لونه عصبی دموی فی مزاجه عظیم الراس فی اعتدال عریض الجبهة فی تناسب واسع العینین ضخیم الوجنات رحب الصدر هش بش عند اللقاء اما خلاقه فلامة القلب سائدة فی صفاته وله حلم عظیم وسع ما شاء الله ان یسع الی ان یدنو منه احد لیمس شرفه او دینه فیتقلب الحلم الی غضب فبینما هو حلیم اواب اذا هو اسد وهاب وهو کریم یبذل ما بیده قوی الاعتماد علی الله لا یبالی ما تاتی به صروف الدهر کمل لمن لا ینیه صعب علی من خاشنه وله سلطة علی دقائق المعانی وتحدیدها وابرازها فی صورها اللائقة بها کان کل معنی قد خلق له کل موضوع یلقی الیه یدخل للبحث فیه کان صنع یدیه فیاتی علی اطرافه ویحیط بجمیع اکنافه،

میں اُن سے ملا تھا، دیر تک لطف کی صحبت رہی، ازہر کی ابتری تعلیم پر افسوس کرتے رہے، لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاکی تھے، اور کہتے تھے کہ ہوا کا ضد سیلاب افسوس ہی کہ گورنمنٹ مصر نے انکو عہدۂ قضا پر مامور کیا ہی وہ سر شتہ تعلیم کیلئے

زیادہ موزوں تھے، چنانچہ خود بھی اس کا افسوس کرتے تھے،

شیخ حمزہ فتح اللہ

پرانے تعلیم یافتہ اور پرانے خیالات کے آدمی ہیں، فن ادب کے بڑے استاد ہیں، دار العلوم میں ادب کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے، انہی کا انتخاب ہے، سر رشتۂ تعلیم کے انسپکٹر ہیں، سوئڈن کی اورنٹیل کانفرنس میں مصری سفارت کے ممبر مقرر ہو کر گئے تھے، اور کانفرنس میں عورتوں کے حقوق کے متعلق ایک رسالہ پیش کیا تھا، جس کا نام حقوق النسار فی الاسلام ہے، یہ رسالہ سرکاری مطبع میں چھاپا گیا ہے، اگرچہ اصل موضوع پر بہت کم لکھا ہے اور جس قدر لکھا ہے وہ بھی مولویانہ لکھا ہے، تاہم عبارت نہایت استادانہ، بلند اور پُرزور ہے،

مجھ سے ان سے نظارۃ المعارف کے دفتر میں ملاقات ہوئی، دیر تک علمی تذکرے رہے، رسالۂ مذکور کی پانچ جلدیں تحفہ کے طور پر عنایت کیں، کچہری سے اٹھ کر اپنے مکان پر لے گئے اور اصرار کر کے کھانا کھلایا، کھانا نہایت سادہ یعنی خشک روٹی اور کھجوریں تھیں، چونکہ وہ عربی زبان کے استاد ہیں اور عرب کے ساتھ ان کو خاص محبت اور لگاؤ ہے، ان کا سادہ عربی کھانا ایک اثر پیدا کرتا تھا،

لطیفہ، میں اور شیخ موصوف کھانا کھا رہے تھے کہ قریب سے ہیچوں ہیچوں کی آواز آئی میں حیران تھا کہ یہ انکر الاصوات کہاں سے آتی ہے، دیکھا تو ایک حجرہ میں گدھا بندھا ہے معلوم ہوا کہ یہاں گھر میں گدھا باندھنا معیوب نہیں، اگرچہ میں بازار میں اکثر لوگوں کو حتی کہ انگریزوں کو گدھے پر سوار پھرتے دیکھ چکا تھا، بلکہ خود بھی دو ایک بار یہ شرف

حاصل کرچکا تھا، تاہم مجھ کو یہ توقع نہ تھی کہ بھلے آدمیوں کے ہاں گھوڑوں کی طرح گدھوں کا بھی اصطبل خانہ ہوتا ہی،

سفر کا خاتمہ اور عربوں کے فیاضانہ اخلاق

مصر کی روانگی کے ساتھ گویا میرے سفر کا بھی خاتمہ ہوگیا، کیونکہ اسکے بعد نہ کوئی نئی آبادی دیکھی، نہ کوئی جدید واقعہ پیش آیا، میں نے سفر کا تمام زمانہ (خلاف توقع) نہایت لطف، آرام، دلچسپی اور اطمینان کے ساتھ بسر کیا، لیکن اس موقع پر یہ بتانا میرا فرض ہی کہ یہ لطف و آرام مجھ کو کیوں نصیب ہوا؟ اور کن لوگوں کی وجہ سے ہوا؟ ان سوالوں کا صرف ایک جواب ہے، یعنی عربوںؐ اور ترکوں کے فیاضانہ اخلاق، حقیقت یہ ہے کہ عربوں کی کریم الاخلاقی سے مجھکو سابقہ نہ پڑتا تو سفر کی دلچسپیوں کا کیا ذکر ہے، زندگی دوبھر ہوجاتی، یہ ظاہر ہے کہ کسی شہر میں جاکر رہنا، کھانا پینا، ملنا جلنا، خرید و فروخت، سیر و تفریح، حالات کی تحقیق و جستجو، دریافت طلب امور کی تلاش، غرض تمام باتیں زبان کے جاننے پر موقوف ہیں، اور میں ترکی زبان سے بالکل ناواقف، عربی زبان جس قدر جانتا تھا وہ بھی بیکار یا قریب قریب بیکار تھی، اس قدر دولت مند بھی نہ تھا کہ بیدریغ روپیوں کے صرف سے اس کمی کا تدارک کر سکتا، ایسی حالت میں چھ مہینے کا زمانہ اس لطف و آرام سے بسر کرنا کہ گویا میں وطن ہی میں تھا، صرف ترکوں اور خاص کر عربوں کی عنایت تھی، ترجمانی یہ کرتے تھے، بازار سے چیزیں یہ لا دیا کرتے تھے، لوگوں سے تعارف یہ کراتے تھے،

ؐ شام و مصر کے اکثر مسلمان عرب کی نسل سے ہیں، اس وجہ سے میں تمام شامیوں اور مصریوں کو بلحاظ اختصار عرب سے تعبیر کرتا ہوں،

قابلِ سیر مقامات کے رہبر یہ بنتے تھے، دل لگی کی صحبتوں میں شریک یہ ہوتے تھے غرض کوئی ایسا کام اور ایسی ضرورت نہ تھی جس کے یہ کفیل نہ تھے، اور لطف یہ کہ بے غرض بے سبب! صرف مہمان پرستی اور غریب نوازی کے لحاظ سے تمام وہ جزئی واقعات جنہیں مجھ کو ان لوگوں کے فیاضانہ اخلاق کا تجربہ ہوا ان کا بیان کرنا ناممکن ہے، نمونہ کے طور پر دو تین واقعے لکھتا ہوں، شیخ عبد الفتاح، شیخ علی ظبیان، خوجی آفندی، عبد الباسط آفندی، شیخ عبد الحکیم آفندی، عبد السلام آفندی کی فیاضیوں کے واقعات جن کو میں پہلے لکھ آیا ہوں، اس موقع پر ایک بار پڑھ لینا چاہیے،

جس زمانہ میں میں قسطنطنیہ میں مقیم تھا عبد السلام آفندی کے برادر عمر ادشاکر آفندی مقدمہ کی ضرورت سے قسطنطنیہ میں آئے عبد السلام آفندی نے انکو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا لیکن انکے کمرہ میں جگہ نہ تھی مجھ سے کہا کہ تم اپنے ساتھ ٹھہرالو، میں نے انکی خاطر سے گوارا کیا، میری روانگی کا زمانہ قریب آیا تو انھوں نے کہا کہ میں بھی آمادۂ سفر ہوں، ساتھ ہوتا تو خوب تھا لیکن اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں گھر سے کچھ روپئے منگوائے ہیں، ان کے آنے کا انتظار ہے، چونکہ وہ خاص بیت المقدس کے رہنے والے تھے، مجھ کو خیال ہوا کہ ان کی وجہ سے آسایش و آرام کے علاوہ بیت المقدس میں مجھ کو ہر ایک چیز کی تحقیق و اطلاع میں بہت مدد ملے گی، میں نے ان سے کہا کہ روپیہ مجھ سے لے لیجئے وہاں چل کر ادا کر دیجئے گا، انھوں نے انکار کیا اور باوجود اصرار کے کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے لیکن میں نے اس قدر مجبور کیا کہ وہ انکار نہ کر سکے، اور میں نے اسی وقت ہار ان کے حوالہ کیے عبد السلام آفندی اس وقت مکان پر نہ تھے، شام کو باہر سے آئے تو بات بات میں یہ تذکرہ آیا انھوں نے یہ واقعہ سنکر سر پیٹ لیا، اور نہایت پریشان ہوئے اور بار

بار کہتے تھے، کہ" شو فعلت شو فعلت یعنی تم نے یہ کیا غضب کیا؟ شاکر گو میرا بھائی ہے لیکن نہایت آوارہ ہے، اور اسی نے تم سے فریب دیکر روپئے لئے"۔ لطف یہ کہ روپیے تو میرے معرض خطر میں تھے، لیکن عبدالسلام آفندی کو مجھ سے بڑھکر اضطراب تھا، شاکر آفندی گھر میں آئے، تو عبدالسلام آفندی نے ان کو سخت ملامت کی اور ان سے دستاویز لکھواکر اس پر اپنی اور ایک اور شخص کی گواہی لکھی، مجھ کو الگ لیجاکر کہا کہ" قومی بدنامی کا معاملہ ہے، اس لئے مجھ کو اپنے بھائی کی پردہ دری کرنی پڑتی ہے" یہ لڑکا (شاکر) آوارہ مزاج اور بدمعاملہ ہے، اسکی کوئی ذاتی جائداد بھی نہیں، اس کا چچا عبدالرزاق اس کا کفیل ہے، یہ دستاویز انہی کے حوالہ کرنا وہ تمکو روپیے دیدینگے،

غرض دوسرے دن شاکر اور میں ساتھ جہاز پر سوار ہوئے، سمرنا میں پہنچے تو شاکر کے نام ان کے وکیل کا تار آیا کہ فوراً واپس آؤ، شاکر نے مجھ سے کہا کہ میں تمکو چھوڑ کر کیونکر جا سکتا ہوں، میں نے انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور بخوشی بلکہ باصرار ان کو واپس بھیجا، بیت المقدس پہنچکر سیدھا عبدالرزاق کے پاس گیا، اور مجھکو اس پر قع پر مجبوری اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے میرے ساتھ سخت بداخلاقی کی، اسکی شکایت نہیں کہ روپیے نہیں دیئے، تعجب یہ ہے کہ کج اخلاقی سے پیش آئے، دوسرے دن میں نے مفتی صاحب (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے) کے پاس جاکر ان سے سارا قصہ کہا اور دستاویز دکھلائی، مفتی صاحب نے عبدالرزاق کے پاس آدمی بھیجا، اُنھوں نے کہلا بھیجا کہ" اس وقت میرے پاس روپیہ نہیں ہے، دو چار دن کے بعد البتہ ادا کر سکتا ہوں، مفتی صاحب کو چونکہ اطمینان تھا وہ یہ کہکر چپ ہو رہے کہ ضرور مل جائیں گے لیکن اور لوگ جو وہاں موجود تھے، اور عبدالرزاق کے خاندان کے

ممبر تھے سخت برہم ہوتے تھے اور غصہ میں آکر کہتے تھے، واللہ یبیع لحیتہ ویودی یعنی وہ اپنی داڑھی بیچے اور روپیہ ادا کرے،

دوسرے دن میں مفتی صاحب کے پاس گیا تو انھوں نے پوری رقم یعنی دو سو روپیہ اپنے پاس سے دیئے، میں نے کہا" آپ اپنی جیب سے دیتے ہیں تو میں لینا نہیں چاہتا، فرمایا کہ نہیں عبدالرزاق نے مجھ پر حوالہ کر دیا ہے، لیکن اگر وہ نہ بھی دیتے اور میرے پاس روپیہ نہ بھی ہوتے تو میں اپنا یہ جبہ بیچکر دیتا، باوجود اس کے مفتی صاحب او دیگر حاضرین کو سخت ندامت تھی، وہ لوگ مجھ سے نہایت الحاح سے معذرت کرتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ" ہماری آنکھ تم سے برابر نہیں ہوتی" میں جب رخصت ہو کر چلا تو مفتی صاحب نے کچھ دور تک مشایعت کی اور کہا کہ المرجو منکم ان تستروا عیوبنا فانہ من شیم الکرام یعنی" مجھ کو امید ہے کہ آپ ہمارے عیب پر پردہ ڈالیں گے کیونکہ شرفا کا کام پردہ پوشی ہے"، مفتی صاحب اور ان ہمنشینوں کو عبدالرزاق کے برتاؤ پر جو ندامت تھی، اور جس طرح وہ بار بار مجھ سے معافی چاہتے تھے اس کا اثر اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اسکندریہ پہنچکر (جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں) ناواقفیت کی وجہ سے مجھ کو سخت پریشانی ہوئی، چونکہ ریل میں دیر تھی ایک قہوہ خانہ میں جو اسٹیشن سے متصل تھا جا بیٹھا، وہاں ایک شامی عرب تشریف رکھتے تھے، مجھکو غیر ملک کا آدمی سمجھ کر یا معلوم نہیں کیوں؟ بڑے تپاک سے پیش آئے، وہ قاہرہ کو جا رہے تھے میں نے ان سے کہا کہ میں ہمسفر ہوں اور چونکہ ناواقفیت کی وجہ سے مجھ کو ہر موقع پر نقصان اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ قاہرہ تک میرا آپ کا ساتھ رہے انھوں نے

کہاکہ بالراس والعین، ان کی وجہ سے مجھ کو تمام سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی، قاہرہ پہنچے تو میں نے ان سے کہاکہ آپ مجھ کو کسی ہوٹل کا نام بتائیں جو جامع ازہر کے قریب ہو، اور فیس بھی زیادہ نہ ہو، میں نے تو صرف پتہ بتانے کو کہا تھا، وہ دو روز تک میرے ساتھ ہوٹل میں مقیم رہے، تیسرے دن کہا کہ "میں ایک ضرورت سے قاہرہ آیا ہوں اور دو تین دن میں مجھ کو واپس جانا ہے، اگر آپ اجازت دیں تو رخصت ہوں،" یہ کہکر ہوٹل کے خانساماں کو دو دن کا کرایہ اور کھانے کی فیس حوالہ کی، میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میری فیس آپ کیوں دیتے ہیں، نہ مانا اور کہاکہ آپ اس وقت تک ہمارے مہمان تھے، یہ کہہ کر رخصت ہوئے اور مجھ کو سخت افسوس رہا، کہ دوبارہ اُن سے ملاقات نہیں ہوئی،

حال کی عربی زبان

چونکہ سفرنامہ کے لوازم میں ایک یہ بھی ہے کہ جس ملک کے حالات لکھے جائیں وہاں کی زبان مروجہ سے بھی بحث کی جائے، اسلئے حال کی عربی زبان کی نسبت جو تمام اضلاعِ شام اور مصر کی زبان ہے کچھ لکھنا ضرور ہے، اس سے ہمارے ہموطنوں کو بھی فائدہ پہنچے گا، جو مصر وشام کے اخبارات کے نہایت شائق ہیں، لیکن مروجہ عربی نہ جاننے کی وجہ سے ان سے متمتع نہیں ہو سکتے،

موجودہ عربی، قدیم عربی سے اس قدر مختلف ہے، کہ ہمارے ملک کا کوئی بڑا عالم اگر مصر و شام کا سفر کرے تو اس کو وہاں کی زبان

کے سمجھنے میں قریبًا وہی دقت ہوگی جو ایک عامی کو ہو سکتی ہے، زبان موجودہ کی وہ خصوصیتیں جن کی وجہ سے وہ قدیم زبان سے مختلف ہوگئی ہے، مختصر طور پر ذیل میں درج ہیں،

(۱) بہت سے الفاظ اس قدر مختصر کر لئے گئے ہیں کہ جب تک کوئی شخص نہ بتائے اصلی الفاظ کی طرف ذہن منتقل نہیں ہو سکتا، اس قسم کے چند الفاظ یہ ہیں،

لفظ تبدیل شدہ	اصل	معنی
شُو	اَیُّ شَیْءٍ	کلمۂ استفہام
مُوش	مَاھُوَشَیْءٌ	حرف نفی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے،
مَاعَلَیْش	مَاعَلَیْہِ شَیْءٌ	کچھ ہرج نہیں، کچھ مضائقہ نہیں،
بِلَاش	بِلَاشَیْءٍ	مفت، اور پہلے لفظ کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے، یعنی کچھ ہرج نہیں،
ھِیْک	ھٰکَذَا	اس طرح،
ھَادُوْلْ	ھٰذِہٖ ھٰؤُلَاءِ	یہ لوگ،
قَدَّیْشْ	قَدْرَاَیِّ شَیْءٍ	کس قدر،

(۲) الفاظ کے اول یا اخیر میں بعض حروف زیادہ کر لئے ہیں، جس سے لفظ کی صورت بالکل بدل جاتی ہے، مثلاً شام میں تمام افعال مضارع کے اول ب زائد کر دیتے ہیں، ان الفاظ کو ما اقول، ما اعرف یوں کہتے ہیں مَابَاقُولْ، مَابَاعْرِفْ، مصر میں الفاظ کے اخیر میں ش بڑھاتے ہیں، مثلاً

یاخذ کے بجائے یاخُذُ ش،

(۳) حروف کا تلفظ نہایت خراب ہو گیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ عربی تلفظ کی تمام خصوصیتیں مٹ گئیں، قاف کے بجائے ہمزہ، جیم کے بجائے گاف، ذال کے بجائے دال، عین کے بجائے ہمزہ بولتے ہیں، اور نہ صرف جاہل اور عامیوں کا یہ تلفظ ہے، بلکہ علمار اور اشراف بھی ان حرفوں کو اسی طرح ادا کرتے ہیں، ایک دفعہ مصر میں میں نے ایک طالب العلم سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں، بولے "گائی مت تگشہ اجاء من جمعۃ" یعنی میں جمعہ مسجد سے آرہا ہوں،

(۴) بہت سے قدیم الفاظ ہیں جن کا طرزِ استعمال بدل گیا ہے، مثلاً جب کسی شخص کی تعریف یا اس کا شکریہ ادا کیا جائے تو وہ جواب میں کہے گا، استغفرا للہ، یعنی میں کس قابل ہوں، یا کوئی تعجب انگیز بات کسی کے سامنے بیان کی جائے تو وہ کہے گا، اَمَانَ یا مثلاً یہ کہنا ہو کہ تم کو اس سے کیا غرض؟ تو کہیں گے شو بلاش۔ شو۔ای۔شیٔ کا مخفف ہے، اور یدّ وہی لفظ ہے جسکو ہم لابدّ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں،

(۵) یورپ کے الفاظ نہایت کثرت سے استعمال میں آگئے ہیں، اور چونکہ کسی قدر ان میں تغیر کر دیا گیا ہے، عربی داں اور انگریزی دانوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، اس قسم کے چند الفاظ مثالاً درج ہیں،

الفاظ معربہ	الفاظ اصلی	الفاظ معربہ	الفاظ اصلی
تلغراف	ٹیلیگراف	فوتوغراف	فوٹوگراف

الفاظ معربہ	الفاظ اصلی	الفاظ معربہ	الفاظ اصلی
بروجرام	پروگرام	بوستہ	پوسٹ، ڈاک
قوماندان	کمانڈر	باریز	پیرس (دارالسلطنت فرانس)
قوماسیون	کمیشن	سیغارہ	سگرٹ
اَفُوکاتو	ایڈوکیٹ	انکلترا	انگلستان
شلین	شلنگ	امبراطور	امپرر
غاز	گیس	لوندرہ	لندن
بازاپورت	پاسپورٹ	ژورنال یا جُرنل	جرنل
اوروبا	یورپ	جُمباز	جمناسٹک
میکانک	مشین (کل)		

اب ہم زبانِ حال کے الفاظ کی ایک مختصر سی فرہنگ درج کرتے ہیں، اس میں اکثر ایسے الفاظ بھی ہیں جو آج سے پانچ چھ برس پہلے ایجاد ہو چکے تھے لیکن چونکہ تصنیفات وغیرہ میں ان کو رواجِ عام حاصل نہیں ہوا تھا، وہ بھی نئے الفاظ خیال کیے جاتے ہیں، خاص اس قسم کے الفاظ پر میں (ق) کی علامت لکھونگا جس سے یہ مطلب ہے کہ وہ قدیم الفاظ ہیں،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
الف		اجزاخانہ (ترکی لفظ ہے)	دواخانہ
امضاء	دستخط	(ق) اُسطول	جنگی جہاز یا جہازوں کا بیڑہ
المان (جرمنی لفظ ہے)	سلطنت جرمنی	اُوطہ یا اُودہ	کمرہ (مکان کا)

لفظ	معنی
آغا، جمع اغوات	خواجہ سرا
امتیاز	لائسنس
اغراض	اسباب
ادب خانہ	پاخانہ
انتیکہ خانہ	قدیم اشیاء کا عجائب خانہ،
اشتراك الجريدة	اخبار کی خریداری اور اخبار کی قیمت کو بدل الاشتراك کہتے ہیں،
ب	
بتاتہ	آلو
(ق) برطل جمع براطیل	رشوت
بلدیہ	میونسپلٹی
باغرہ	دخانی جہاز
(ق) برنامج (فارسی لفظ ہے)	فہرست
براد	چائدان
بیتُ الماء	پاخانہ
(ق) بدوی	سویرا
بکیر	سویرا

لفظ	معنی
باش کاتب (ترکی ہے)	میر منشی
ت	
تکہ	ازار بند
ترعہ	بڑا تالاب
تمونیات عسکریہ	قواعد (فوج)
تشخیص	تھیٹر میں ایکٹ کرنا
تذکرہ	پروانہ، ٹکٹ، سند
تطعیم الجدری	چیچک کا ٹیکا
تمرینات جسدیہ	ورزش
ث	
ثورہ	بغاوت
(ق) ثریا	جھاڑ (روشنی کا)
ثوب	لمبا کرتہ
ج	
(ق) جریدہ[1] جمع جرائد	اخبار
(ق) جبن	پنیر
جوخ	بانات

[1] پہلی فوج کی تنخواہ کے رجسٹر کو کہتے ہیں،

لفظ	معنی
جمعیّۃ	انجمن
جمرک دیا، گمرک (ترکی ہے)	چنگی
جنینۃ	باغ

ح

لفظ	معنی
حوائج	میلے کپڑے جو دھونے کیلئے دیئے جاتے ہیں
(ق) حرّاقہ	تارپیڈو کی کشتی
(ق) حلیب	دودھ
حزب الاحرار	لبرل پارٹی

خ

لفظ	معنی
خریطہ	نقشہ (جغرافیہ کا)
(ق) خان	سرائے ہوٹل

د

لفظ	معنی
دلیجانس (عربی نہیں ہے)	شکرم
دائرہ	محکمہ، صیغہ
دقیقہ	منٹ

ر

لفظ	معنی
(ق) رَبّان	کپتان جہاز
روایہ	ناول، قصہ
رومان (انگریزی لفظ ہے)	ناول، قصہ
ریش	نب۔ انگریزی قلم کی زبان
ربطۃ الرقبہ	نکٹائی
رصاص	بندوق کی گولی
رسم	تصویر، نقشہ

ز

لفظ	معنی
زنّار	پیٹی

س

لفظ	معنی
(ق) ساعۃ	گھڑی جس سے وقت معلوم ہوتا ہے
سکۃ الحدید	ریلوے
سکورۃ (انگریزی سے ماخوذ ہے)	بیمہ کرنا
سجادہ	قالین، دری
سیاسۃ	پالٹیکس
سریر	چارپائی

ش

لفظ	معنی
شرکة	کمپنی
شوکة	کانٹا (جس سے انگریز کھانا کھاتے ہیں)
شمسیہ	چھتری
شمندوفر (فرنچ زبان حال کا لفظ ہے)	ریل
شنطہ	پوٹ منٹو، بڑا صندوق
(ق) شخطورہ	چھوٹی کشتی
ص	
(ق) صیدلیۃ	عطار کی دوکان
(ق) صہریج	تالاب
صوت	ووٹ
ض	
ضو	چراغ، لمپ
(ق) ضریبۃ	ٹکس
ضبطیہ	پولس
ضابط، جمع ضباط	افسر فوج

لفظ	معنی
ط	
طربوش	ٹرکی ٹوپی
طبسی	سینی
ظ	
ظرف	لفافہ
ع	
(ق) عُلبَہ	ڈبیہ
(ق) عیش	روٹی
عیش افرنجی	پاؤروٹی
عمارہ	بیڑہ جہازیت
(ق) عربیۃ	گاڈی
عجلہ	"
عمد	اخبار کا کالم
عضو جمع اعضا	ممبر (کمیٹی)
غ	
غسیل	کپڑے کی دھلائی

ف

لفظ	معنی
فُراطه	ریزگاری، روپیہ کا خُردہ
(ق) فلوکه	ڈونگی، چھوٹی کشتی
فطره۔ یا فطور	ناشتہ، صبح کا کھانا
فابریقه انگریزی لفظ ہے	کل وغیرہ کا کارخانہ
(ق) فرجة	سیر و تفریح
فَراجة	ترکش عورتوں کا برقع
(ق) فندق	ہوٹل
(ق) فنجان جمع فناجین	پیالی

ق

لفظ	معنی
(ق) قائمه	فہرست کتب
قرار	رزولیوشن، حکم
قائمقام	ایک عہدہ کا نام ہے جو ہمارے ہاں کے ڈپٹی کلکٹری کے قریب ہے
قرینه	زوجہ بیگم

ک

لفظ	معنی
کفیه	ٹوپی
کندره (ترکی ہے، غالباً)	بوٹ
کَرُوسه	شکرم
(ق) کاک، یا کعك	بسکٹ
کبریت	دیاسلائی

ل

لفظ	معنی
لائحة	فہرست
لفة	عمامہ جو ٹوپی کے اوپر باندھتے ہیں
لیره	پونڈ، اشرفی
لوکانده (عربی نہیں ہے)	ہوٹل
(ق) لجنة	کمیٹی
لحظة	سکنڈ (منٹ کا ساٹھواں حصہ)
لیلی	بوردر (بشرطیکہ یہ لفظ طالب علموں کیلئے استعمال کیا جائے)
لباس	پاجامہ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
لبن	دہی	مُفتِش	انسپکٹر
م		محفظۃ	نوٹ بک یادداشت کی کتاب
		متحف	عجائب خانہ
مَصَاری	فلوس، پیسے	مُشَمع	موم جامہ
مُستَشفیٰ	اسپتال	مسکوب	سلطنت روس
مرفا	گھاٹ، بندرگاہ	مرکن	گلدان
مومسات	رنڈیاں، کسبیاں	(ق) مِخَدَّہ	تکیہ
مِقَصّ	قینچی	مِقلَمۃ	قلم تراش چاقو
(ق) مُزیّن	حجام	ملعقہ	چمچہ
موتمر	کانفرنس	(ق) مظِلّۃ	چھتری
مندوب	ڈیلیگیٹ سفیر، وکیل	محرمہ	رومال
محجر	قرنطینہ	(ق) مندیل	״
ماموریّۃ	نوکری	منشفہ	تولیہ
مدفع	توپ	مرکوب	جوتا
مَضبطۃ	موریل، عرضداشت	مداسہ	سلیپر۔ گھر میں پہننے کے جوتے،
مَعمل	کارخانہ		
معرض	نمائش گاہ	محطّہ	ریل کا اسٹیشن
مَتصرّف	ایک عہدہ کا نام ہے،		

لفظ	معنی
(ق) مجلۃ[۱]	میگزین، علمی رسالہ
مدرعہ	آہن پوش جہاز
محکمہ	عدالت
محکمۃ الحقوق	عدالت دیوانی
محکمۃ الجزاء	عدالت فوجداری
محکمۃ الاستیناف	عدالتِ اپیل
محکمۃ التمئیز	ہائیکورٹ
محامی	وکیل
(ق) مینا	گھاٹ
(ق) مَرکب	جہاز
مُمثِل	ایکٹر
مسوکرہ (انگریزی سے ماخوذ ہے)	رجسٹری شدہ خط یا پارسل وغیرہ
میزانیہ	بجٹ
مصلحۃ	محکمہ صیغہ جیسے مصلحۃ البوسط بمعنی ڈاکخانہ

۱؎ جاہلیۃ میں اس کتاب کو کہتے تھے جسمیں حکمت و موعظت کے مضامین ہوں، نابغہ کا شعر ہے ؎

مجلتھم ذات الالہ ودینھم،
قدیم فما یرجون غیر العواقب

لفظ	معنی
معاش	پنشن
مجاور	قدیم مدارس کے طالب العلم
محل الادب	پاخانہ
مُکارہ	چرخی
مادّہ	دفعہ (قانون وغیرہ کی کتاب)
معارف	سررشتہ تعلیم
مُجسّمہ	اسٹیچو (پورے قد کی مورت)
مزایدہ	نیلام

ن

لفظ	معنی
نہاری	غیر اور ڈور طالب العلم، انکو خارجی بھی کہتے ہیں۔
نیشان جمع نشانات	تمغہ
(ق) ناموسیۃ	پلنگ
نمسا	سلطنت اسٹریا
نادریّۃ	آتشبازی
نظارۃ	دوربین
(ق) نظارہ	سررشتہ۔ صیغہ
ناظر	سکریٹری،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
نادگیلة (فارسی)	حقه	ورقة	ٹکٹ
و		ورقة الزیارت	ملاقات کا کارڈ
		(ق) وصول	رسید
وسلم	تمغه	ویرکو	ٹکس
وابور یا فابور (عربی نہیں ہے)	جہاز	(عربی نہیں ہے)	
		ورق	کاغذ

دارالمصنفین کی بعض کتابیں

دولتِ عثمانیہ

(حصۂ اوّل)

یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصّہ میں عثمان اوّل سے مصطفےٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، اُردو میں ابتک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مفصل، مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی

مرتبۂ محمد عزیز صاحب ایم اے سابق رفیق دارالمصنفین

ضخامت ۴۹۰ صفحے، قیمت:- سے ر

دنیائے اسلام اور خلافت

موجودہ عہد میں خلافت عثمانیہ کے قیام و بقا کے لئے دنیا کی مسلمان قومیں کیا جد و جہد کر رہی ہیں

قیمت :- ۶ ر

خلافت اور ہندوستان

آغاز اسلام سے اس عہد تک مسلمانانِ ہند کو خلفائے اسلام سے جو تعلقات رہے ہیں، انکی تشریح اور سلاطین ہند کی تاریخ، سکوں اور کتبوں سے اُن کے تعلّقات کا ثبوت، قیمت : ۸ ر

عرب کی موجودہ حکومتیں

جزیرۃ العرب کیساتھ مذہبی تعلق و عقیدت کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کو نجد و حجاز کے علاوہ عرب کے دوسرے حصّوں اور حکومتوں کے حالات سے بہت کم واقفیت ہی، اس لئے اس کتاب میں عرب کا تفصیلی جغرافیہ اور تمام قابل ذکر حکومتوں نجد و حجاز، عسیر و یمن، نجج، نواحیِ تسعہ، بحرین، کویت اور فلسطین و شام کے مختصر حالات جمع کردیئے گئے ہیں، ضخامت ۱۷۰ صفحے، قیمت عہ ر

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، قیمت عہ ر

(طابع و ناشر محمد اویس وارثی)